تصویر کا تیسرا رُخ

رزم صدیقی

اُردو منزل

اُردو بازار ——— لاہور

بندر روڈ ——— کراچی

قیمت دو روپے بارہ آنے

بار اوّل

فہرست

[illegible]

فریب رنگیں

لالہ جگدیش مل کا سارے شہر میں اگر ایک طرف تمول اور سرمایہ داری میں کوئی جواب نہ تھا تو دوسری طرف وہ اپنی قدامت پسندی، وضعداری اور مزاج کی سادگی میں بھی ضرب المثل کی حیثیت رکھتے تھے۔ کم و بیش زندگی کی ساٹھ بہاریں انہوں نے دھوتی اور کرتے میں گزار دیں۔ اور کبھی کوئی دوسرا لباس پسند نہ کیا۔ ہاں بے دیکھے اگر انہوں نے اپنی وضعداری کے خلاف اس طویل دورِ حیات میں کوئی قدم اٹھایا تو صرف یہ کہ اپنے اکلوتے بیٹے منوہر کو نہ صرف دورِ حاضر کی اعلیٰ تعلیم دلوائی بلکہ اُسے ایک مکمل انجینیر بنانے کے لئے ولایت بھی بھیجا جہاں سے ابھی چند مہینے ہوئے اس نے واپس آکر بہت سے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔

منوہر بھی اپنے روایات خاندانی کے بموجب ایک فرمانبردار، جفاکش اور ہوشمند نوجوان تھا۔ انگریزی تعلیم اور غیر ممالک کی سوسائٹی کا اگر کوئی اثر ہوا تو صرف اس قدر کہ دھوتی اور اور کرتے کے بجائے سوٹ پہننے لگا۔ فٹن کی جگہ موٹر نے لی اور موجودہ مکان کے

کے بالائی حصہ پر چند مخصوص کمرے انگریزی وضع کے بنوالئے تھے جو میز کرسی صوفوں اور مسہری وغیرہ سے مزین تھے۔

ایک روز صبح کو لالہ جگدیش مل ایک کاغذ ہاتھ میں لئے منوہر کی نشست گاہ میں پہنچ کر بیٹھے سے بولے،

"منوہر میں تین بار رام داس کی رخصت نامنظور کر چکا ہوں۔ پھر اس کی درخواست آئی ہے، اس کی بیوی سخت بیمار ہے۔ ایسی حالت میں رخصت نہ دینا انسانیت سے بعید ہے۔ اس لئے تمہیں آج ہی میل سے روانہ ہو کر اُسے کل سبکدوش کرنا ہوگا۔ فوراً سفر کی تیاری کرو۔ وقت کم ہے"۔

مئی کا مہینہ، لو اور گرمی کی شدت، ریل کا سفر، جنگل میں جا کر کوئلے کی کان کی نگرانی کرنا۔ یہ تمام باتیں گو منوہر کے لئے انتہائی صبر آزما اور ہمت شکن تھیں لیکن باپ کا حکم اور موقع کی نزاکت نے طوعاً کرہاً اُسے تعمیلِ ارشاد کے لئے مجبور کر ہی دیا۔ ملازم کو بلا کر سفر کی تیاری کا حکم دے دیا گیا اور چند گھنٹے بعد منوہر میل ٹرین کے فسٹ کلاس میں جگدیش نگر کی جانب سفر کر رہا تھا۔

جگدیش نگر ایک بالکل بے آب و گیاہ اور ویران مقام تھا۔ کان میں کام کرنے والوں کے علاوہ کچھ فاصلے پر چھوٹی سی آبادی تھی جس میں نہایت چھوٹے درجے کے لوگ آباد تھے۔ منوہر کے خیمہ سے چند گز کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ جس کے گرد دو چار تاڑ کے درخت تھے۔ یہ کیفیت تھی اس مختصر سی دنیا کی جس میں کم از کم ایک مہینہ منوہر کو بسر کرنا تھا۔

ولایت کے دوران قیام میں منوہر کی مصوری سے بھی دلچسپی ہو گئی تھی۔ اور

فنی حیثیت سے قطع نظر کم از کم دل بہلانے کا یہ ایک مشغلہ ضرور تھا۔ لیکن بدنصیبی سے اس کے قدرتی سامان بھی یہاں فراہم نہ تھے۔ بہر حال منوہر کیلئے یہاں کا قیام ایک عذاب سے کم نہ تھا۔ جسے چار و ناچار اُسے بھگتنا تھا۔

× × × × × ×

روزانہ کا معمول تھا کہ منوہر ناشتہ سے فارغ ہو کر آٹھ بجے تک کان کے دفتر پہنچ جاتا چھوٹی حاضری دفتر میں ہی آجاتی، ایک بجے لنچ کے لئے کیمپ میں آکر آرام کرتا۔ اور قریب شام دفتر کا ایک چکر اور لگتا تھا۔

ایک دن ناشتہ سے فارغ ہو کر دفتر جانے کے لئے اس نے ہیٹ اور چھڑی اٹھائی تھی کہ سامنے آبادی سے ایک نوجوان لڑکی کمر پر پیتل کا گگرا رکھے، بغل میں ایک پوٹلی دبائے اور چھوٹی سی لٹیا ہاتھ میں لئے خراماں خراماں تالاب کی طرف آتی دکھائی دی۔ گھاٹ پر پہنچ کر لڑکی نے گگرا زمین پر رکھا۔ اس کے اوپر پوٹلی رکھی۔ اور لٹیا سے پانی بھر بھر کر نہانا شروع کر دیا۔

اس سے پہلے ہی لڑکی کے ہر انداز سے اُس کے شباب کی رنگینیاں اور حُسن کی دلکشی نمایاں تھی۔ لیکن ساری پر، جو اس کے جسم کا واحد ملبوس تھا۔ پانی پڑنے سے یہ پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا۔ اس پر مستزاد لڑکی کا نہایت لاپروائی اور الہڑپن سے نہانا۔ ان چیزوں نے مل جُل کر منوہر کو کچھ ایسا مبہوت اور خود فراموش بنا دیا کہ ایک گھنٹہ گزر گیا اور وہ نقشِ دیوار بنا اس منظر کو دیکھتا رہا۔

خدا خدا کر کے نہانا ختم ہُوا لڑکی نے بھیگی ہوئی ساری کو جا بجا سے نچوڑ کر گٹھری سے خشک ساری نکال کر باندھی۔ بھیگی ساری از سر نو دھو کر بغل میں دبائی اور

کچھ دور پانی میں جا کر صاف پانی سے گگرے کو بھرا۔ اور آہستہ خرامی سے آبادی کی طرف واپس ہو گئی۔

* * * * * * *

ابھی لڑکی آنکھوں سے اوجھل ہوئی تھی کہ منوہر اس دلچسپ خواب سے بیدار ہؤا۔ اب منوہر کی دنیا بدلی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے روبرو وہی منظر تھا اور دل میں ایک کسک، گہری ٹھنڈی سانس لے کر وہ خیمہ سے باہر آنے کو ہی تھا کہ یکایک اس نے ملازم کو آواز دی۔

"شنکر"

خیمہ کے دوسرے حصہ سے شنکر سامنے آکر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"شنکر تم اسی لڑکی سے واقف ہو جو ابھی تالاب میں نہا رہی تھی۔ وہ سامنے جا رہی ہے۔"

"بابو جی۔ یہ لڑکی تو گاؤں میں شاید نئی آئی ہے" ملازم نے جواب دیا۔

"کیا تم پتہ لگا سکتے ہو کہ یہ کون اور کس کی لڑکی ہے"۔

"کیوں نہیں، لیکن اس گاؤں میں سوائے کوری چماروں کے اور کون ہو سکتا ہے"۔

"اس سے غرض نہیں کہ اس کی ذات کیا ہے۔ صرف یہ پتہ لگاؤ۔ کہ وہ کون ہے۔ ایک بجے تک پتہ لگ جانا چاہیئے۔"

"بہت اچھا میں ابھی گاؤں جاتا ہوں"۔

* * * * * *

ایک بجے تک دفتر میں بیٹھنا منوہر کے لئے دوبھر ہو گیا۔ خیمہ میں واپس آتے ہی شنکر سے سوال کیا۔

"کیوں جی کچھ پتہ چلا؟"

"جی ہاں وہ ایک چمار کی لڑکی ہے اور اپنے کسی عزیز سے ملنے آئی ہے۔ وہ تعلیم یافتہ اور بہت نفاست پسند ہے۔ ایک کوٹھری میں رہتی ہے اور کھانا خود اپنے ہاتھ سے بناتی ہے۔"

"کیا تم اسے اس کے لئے آمادہ کر سکتے ہو کہ وہ روزانہ اسی تالاب میں نہانے آئے اور مجھے تصویر کشی کا موقع دے؟"

"کیوں نہیں حضور" شنکر نے جواب دیا۔ زیادہ سے زیادہ کچھ معاوضہ لے لیگی"

"خیر اس کی فکر نہیں۔" منوہر نے لاپرواہی سے کہا۔

"اگر وہ رضامند ہو تو کل صبح آٹھ بجے اس کو بلا لو، مگر یہ بھی کہہ دینا کہ یہ کام کئی دنوں میں ختم ہو گا۔"

بہت اچھا حضور، بظاہر اس میں اس کے لئے دشواری کیا ہے۔ یوں بھی آخر روزانہ نہاتی ہی ہے۔ اگر اس نے نخرے کئے تو دوسری لائی جا سکتی ہے۔"

"نہیں" منوہر نے چین بجبیں ہو کر کہا۔ "دوسری کی ضرورت نہیں۔ کسی نہ کسی طرح اسی کو رضامند کرو۔"

"بہتر ہے حضور اسی کو آمادہ کیا جائے گا۔"

ت کاٹنا منوہر کے لئے مشکل ہوگیا۔ صبح اٹھتے ہی شنکر کو بلا کر بے تابی سے دریافت کیا۔

"کہو جی لڑکی کو ٹھیک کرلیا؟"

"جی ہاں وہ ٹھیک آٹھ بجے تالاب پر آجائے گی۔"

"رضامند کرنے میں زیادہ دقت تو نہیں ہوئی۔"

"پہلے تو ضرور اس نے ناک بھوں سکیڑی تھی، بولی کہ میں یہاں چند روزہ مہمان ہوں اس تماشہ کو میرے اعزا اور ماں باپ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ مگر میرے اس کہنے پر کہ آخر یوں بھی تم روزانہ وہیں نہانے جاتی ہو۔ اس میں اضافہ یا ترمیم تو ہوگا نہیں، وہ تیار ہوگئی۔"

"شاباش، تم بڑے وفادار ملازم ہو" منوہر نے خوش ہو کر کہا۔ "شنکر جب تک میں ناشتہ کروں چھوٹی میز اور تصویر کشی کا سامان خیمہ کے برآمدے میں لگا دو اور لڑکی کے آنے کی فوراً اطلاع دو۔ اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔"

× × × × × ×

ابھی آٹھ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے کہ شنکر نے اطلاع دی کہ لڑکی گھاٹ پر ان کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ سنتے ہی منوہر کی باچھیں کھل گئیں۔ بہت خوش خوش سگریٹ پیتا خیمہ سے باہر آیا۔ لڑکی نے دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر مؤدبانہ سلام کیا جس کا جواب سر کے اشارے سے دیتے ہوئے تصویر کشی کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ اور لڑکی سے مسکراتے ہوئے بولا

"اب دو چار لوٹے پانی کے جسم پر ڈال کر کھڑی ہو جایئے۔ اور جب تک میں نہ

کہوں جسم کو حرکت نہ دیجیئےگا۔"

"بہت خوب" لڑکی نے سادگی سے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

تقریباً آدھ گھنٹہ تک لڑکی بے حس و حرکت کھڑی رہی اور منوہر دلچسپی سے تصویر کشی میں مصروف رہا۔ ادھوری تصویر کے خاکہ پر اطمینان کی نظر ڈالتے ہوئے منوہر نے لڑکی کے قریب جا کر احسانمندانہ انداز میں کہا۔

"آج پہلا دن ہے۔ بس اتنی دیر کافی ہے۔ مجھے امید ہے آپ کو زیادہ زحمت نہ ہوئی ہوگی۔"

لڑکی نے مسکراتے ہوئے کسی قدر محجوب ہو کر جواب دیا۔

"جی اس میں تکلیف کا ہے کو ہوتی۔ مجھے تو خود فکر تھی۔ کہ میری ناتجربہ کاری سے آپ کو تو کوئی زحمت نہیں ہوئی۔"

"بالکل نہیں۔ آپ تو نہایت مشاق معلوم ہوتی ہیں۔ اچھا اب آپ جا سکتی ہیں۔ آپ کی زحمت کا بہت شکریہ" کچھ سوچکر، اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو اپنا نام بتاتی جائیے۔"

"مجھے شکنتلا کہتے ہیں"۔

٭٭٭٭٭٭٭

پورے دس روز تک یہ دلچسپ سلسلہ جاری رہا۔ ان دنوں میں اتنی تبدیلی ضرور ہوئی کہ کسی دن شکنتلا کو صبح اور کسی دن شام کو تالاب پر آکر تصویر کشی کا معمول بننا پڑا۔ جیسے جیسے تصویر مکمل ہوتی جا رہی تھی اسی رفتار سے منوہر اور شکنتلا کے درمیان بے تکلفی ترقی کر رہی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مصوری کا کام ختم ہو جانے کے بعد گھنٹوں دونوں

آپس میں مختلف موضوع پر گفتگو کرتے رہتے اور یہ تو منوہر کا معمول ہو گیا تھا۔ کہ وہ روزانہ شکنتلا کو گاؤں تک پہنچانے ضرور جاتا۔

آج دسواں دن تھا اور شام کا وقت اب تصویر کے ختم ہونے میں اتنی کسر باقی تھی کہ جابجا اسکی باریک ترین خامیوں کو دور کر دیا جائے یا کہیں کہیں خفیف سا اضافہ کر کے اسے اس قدر مکمل بنا دیا جائے کہ وہ ہر حیثیت سے منوہر کا شاہکار کہے جانے کے قابل ہو سکے۔ کم و بیش ایک گھنٹہ تک ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ بھی جاری رہا اب منوہر کی یہ کیفیت تھی کہ اس کی نظریں تصویر سے زیادہ شکنتلا پر جمنے لگیں، چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ بار بار ٹھنڈی سانسیں لی جا رہی تھیں۔ دل کی رفتار تیز تھی۔ ہاتھوں کی لغزش برش سے کام لینے میں سدّراہ ہو رہی تھی۔ بالآخر جھنجھلا کر منوہر نے برش پھینک دیا اور شکنتلا کے سامنے پہنچ کر بولا۔

"شکنتلا اب میں زیادہ عرصہ تک ضبط نہیں کر سکتا"

شکنتلا کی نگاہوں نے پہلے تو پر سکون انداز میں منوہر کی اس غیر معمولی کیفیت کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا پھر نہایت متانت اور سنجیدگی سے بولی۔

"خیریت تو ہے۔ مجھ سے کونسا قصور ہوا جس کو آپ ضبط نہیں کر سکتے۔ اگر خدانخواستہ میری کسی حرکت سے آپ کی تصویر تو خراب نہیں ہو گئی۔ اگر ایسا ہوا ہے تو میں دست بستہ معافی چاہتی ہوں"

"نہیں شکنتلا ایسا نہیں ہے"۔ منوہر نے اور نزدیک آتے ہوئے کہا "شکنتلا میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا"

شکنتلا کے چہرے پر شرم و حیا کی سرخی نمایاں ہوئی۔ گردن جھکا کر بولی۔

"آپ غلطی کر رہے ہیں۔ جذبات سے کام نہ لیجئے۔ غور کیجئے کہاں آپ اور کہاں میں۔"

"شکنتلا، میں نے پہلی بار تمہیں دیکھنے کے بعد آج تک راتوں کی نیند حرام کر کے اس مسئلہ پر غور کیا ہے۔ لیکن سوائے اس کے دوسرا فیصلہ نہ کر سکا کہ بغیر تمہارے میرا زندہ رہنا ناممکن ہے۔"

"آپ ایک پڑھے لکھے اور سمجھدار انسان ہو کر ایسی غلطی نہ کیجئے۔ کہاں میں ایک ادنیٰ ذات کی لڑکی اور کہاں آپ ایک اعلیٰ اور متمول خاندان کے فرد۔ بھلا میرا اور آپ کا کیا جوڑ۔ میں دو ایک روز میں اس گاؤں سے جانے والی ہوں۔ آپ بھی اپنے کاروبار میں مصروف ہو جائیے۔ اور اس واقعہ کو ایک خواب سمجھ کر بھول جائیے۔"

"شکنتلا" منوہر نے شکنتلا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "میں عہد کر چکا ہوں کہ سوائے تمہارے کسی اور کو اپنا شریکِ حیات نہ بناؤں گا۔ اور اگر تم نے انکار کیا تو سمجھ لو کہ میرے بجائے میری موت کی خبر مکان پر پہنچے گی۔"

شکنتلا نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی اور بدستور گردن جھکاتے ہوئے بولی۔

"میری وجہ سے اپنے خاندان کو بٹہ نہ لگایئے بھگوان نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ اعلیٰ ذات۔ دھن دولت۔ تعلیم۔ تندرستی۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ اس خیال سے باز آئیے۔ مجھ سے کہیں بہتر لڑکیاں آپ کو مل سکتی ہیں۔"

"شکنتلا" منوہر نے پر جوش لہجہ میں کہا۔ "یہ ساری نصیحت بے کار ہے۔

اب میں تمہارا ہاتھ پکڑ چکا ہوں اور یہ اس وقت چھوٹ سکتا ہے جب تم اقرار کرو گی یا منوہر کے جسم میں جان نہ ہوگی۔"

"لالہ جگدیش مل بڑے قدامت پسند آدمی ہیں۔ آپ کو روپیہ پیسہ اور جائداد سے محروم کر دیں گے۔"

"اس کی قطعی پروا نہیں۔ باپ دادا کی میراث سے زیادہ مجھے اپنی قوت بازو پہ بھروسہ ہے۔ لالہ نے بارہا اپنے شریک کار لالہ خوبی لال کی لڑکی کا پیام دلوایا مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔"

"کیوں" شکنتلا نے گردن اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میں اس معاملہ میں سماج کی قیود کا پابند نہیں۔ شادی ہو میری اور بیوی پسند کریں دوسرے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔"

"آپ نے لالہ خوبی لال کی لڑکی کو دیکھا بھی تھا" شکنتلا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جو راستہ چلنا ہی نہ ہو اس کے میل گننے سے فائدہ۔ دیکھ کر کیا کرتا۔"

"اچھا اب آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ لالہ خوبی لال کی لڑکی میں ہی ہوں۔"

"ارے .... تم ...... لالہ خوبی لال .... کی ...... لڑکی۔ ۔؟"

یہ کہتے ہوئے منوہر اس طرح گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس بدحواسی پر شکنتلا کو بے اختیار ہنسی آئی۔ اس نے مسرت آمیز قہقہہ لگاتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"دیکھئے آپ کیچڑ میں چلے گئے۔ جوتے اور پتلون کا ستیاناس ہو گیا۔ مجھے میرے ہاتھ کا سہارا لیکر پتھر پر آجایئے۔"

زندہ درگور

خیر یہاں تک تو پبلک اور پولیس دونوں کے واسطے لندن ایسے بے پناہ شہر میں یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ فرض کر لیجئے مسٹر ڈگلس پولیس کو اطلاع دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ہمسایہ مسٹر براؤن کو کئی دن سے نہیں دیکھا۔ مکان اندر سے بند اور تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد پولیس ایک سارجنٹ کو روانہ کرتی ہے۔ وہ تالا توڑ کر مسٹر براؤن کے مکان میں داخل ہوتا ہے۔ اور چند منٹ کی دیکھ بھال سے پتہ چلتا ہے کہ مسٹر براؤن اپنی خوابگاہ میں نہایت اطمینان سے مسہری پر قیامت تک کی نیت باندھے موت کی گہری اور غالباً خوشگوار نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ ہر چیز قرینہ سے رکھی ہے اور بظاہر کسی متنفس کے مکان میں داخل ہونے کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں پولیس کو بھی تمام جھگڑوں سے نجات

مل گئی۔ مسٹر براؤن کو قبرستان کے کسی گوشہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ کسی عزیز کے دستیاب ہونے کی امید موہوم پر سارا مال و اسباب گورنمنٹ کی نگرانی میں پہنچ گیا۔ اور پنچایت نامہ کے خانہ کیفیت میں لکھدیا گیا کہ متوفی نے خود کشی کی یا کسی مہلک مرض میں اچانک مبتلا ہو کر مر گیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

لیکن تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ جس کے سامنے آجانے سے پولیس تو پولیس پبلک میں بھی ایک گروہ کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ اور فکر سے راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے صحیح معنوں میں یہی مخلص حضرات ہیں جو خدائی فوجدار کے اعلیٰ لقب سے یاد کئے جا سکتے ہیں۔ اور جو قاضی جی کی طرح شہر کے اندیشہ سے ہمیشہ دبلے رہتے ہیں۔

یعنی پولیس کو اطلاع ملتی ہے کہ مس ایلو کئی مہینوں سے قطعی غائب ہے معلوم نہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ روانگی سے قبل اس کا بیان تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے واسطے سوئٹزرلینڈ جا رہی ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد رپورٹ ہوتی ہے کہ مسٹر جالوس بوائسن ایک روز شام کو حسب معمول مکان سے نکل کر بغرض تفریح تشریف لے گئے تھے۔ آج تک واپس نہیں آئے آپ ایک مُسن اور نہایت نازک مزاج بزرگ تھے۔ محلہ میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جسکو جناب سے تھپڑ اور بعض اوقات گالی گلوچ کا شرف حاصل نہ ہوا ہو۔ زیادہ تر جناب کو محلہ کے بچوں سے یہ شکایت تھی کہ ان کے غل و شور سے جناب کے آرام میں خلل واقع ہوتا ہے۔ یہ آدم بیزار بزرگ مکان میں صرف تین بلیوں کے ساتھ تنہا رہتے تھے۔ اور جناب کا کوئی خاص ذریعہ معاش یا شغل نہ تھا۔ علاوہ دیگر محاسن کے جناب کو کنجوس ہونے کا فخر بھی حاصل تھا۔ لیکن بظاہر مالی حالت نہایت اچھی تھی۔

یہی حالت مسز ہارٹنگ کی ہوئی۔ یہ ضعیف بیوہ اپنی ایک بھتیجی کے ہمراہ رہتی تھیں۔ اور مہینوں سے یہ اصول تھا کہ ہر مہینے کی ایک معینہ تاریخ پر بغیر کسی قسم کا ارادہ کسی پر ظاہر کئے ہوئے کہ کہاں جا رہی ہیں، روپوش ہو جایا کرتی تھیں اور زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے بعد واپس آجاتی تھیں۔ ان کی عدم موجودگی میں بھتیجی کو اجازت تھی کہ وہ خورد و نوش کا سامان محلے کے دوکاندار سے قرض لے آیا کرے۔ جس کا مطالبہ یہ بزرگ واپسی پر بہت کچھ چیں بجبیں ہو کر طوعاً کرعاً ادا کر دیا کرتی تھیں۔ حسب معمول ایک مرتبہ جو غروب ہوئیں تو پھر واپس نہ ہونا تھا نہ ہوئیں۔ تقریباً چھ ماہ فضول انتظار کے بعد بھتیجی نے ایک اخبار کے ذریعے چچی کی گمشدگی کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح یہ خبر بھی پولیس تک پہنچی۔

"کس قدر حیرت انگیز واقعات ہیں" پولیس افسر نے آہستہ سے کہا۔ جس کے سامنے چار رپورٹیں اسی قسم کی موجود تھیں۔ جن میں تین عورتیں اور ایک مرد تھا چیں بجبیں ہو کر افسر نے گھنٹی بجائی اور ملازم کو مسٹر ریڈر خفیہ پولیس کے بلانے کا حکم دے کر پھر خاموشی سے غور کرنے لگا۔

مسٹر ریڈر حسب معمول معہ چھاتہ اور ڈنڈا کے کمرہ میں داخل ہوئے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے ناک کے سرے پر پرانی چال کی عینک کے شیشوں سے رپورٹوں کو دیکھ کر معنی خیز انداز سے گردن ہلاتی۔ لیکن بظاہر معاملہ کی اہمیت سے قطعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے، افسر کی طرف سے گفتگو کی ابتدا ہونے کے لئے انتظار کرنے لگے۔

پولیس افسر نے رپورٹوں کو مسٹر ریڈر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ان گم شدگیوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

مسٹر ریڈر نے رپورٹوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"لندن ایک عظیم الشان شہر ہے جس میں ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ مجھے البتہ اس بات کا تعجب ضرور ہے کہ یہ لوگ ایک مقررہ اصول کے بموجب باقاعدہ طور پر غائب نہیں ہوتے۔"

پولیس افسر نے مسٹر ریڈر کے اس ظریفانہ جواب پر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تب تو میری رائے میں اتنے بڑے شہر کے واسطے صرف چار آدمیوں کی گمشدگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اسی قسم کی اور رپورٹوں کا بھی انتظار کرنا چاہیے"

مسٹر ریڈر نے نہایت اطمینانی لہجہ میں جواب دیا۔

"جناب ۲۷ آدمی بارہ مہینہ میں غائب ہو چکے ہیں"

اب تو پولیس افسر کے تعجب اور حیرت کی انتہا نہ تھی۔ چونک کر بولے۔

"کیا کہا۔ ۲۷۔ یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو؟"

مسٹر ریڈر نے بصورت اثبات سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"قطعی یقین کے ساتھ۔ یہ سب لوگ معمولی بچی کے آدمی تھے۔ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو یہ لوگ ایک خاص رقم کہیں سے وصول کر لاتے تھے۔ اب یہ رقم ان لوگوں کو کہاں سے ملتی تھی اس کے متعلق ان میں کا ہر شخص انتہائی رازداری برتتا تھا۔ کم سے کم ۲۷ میں سے ۱۹ کا تو یہی حال تھا۔ جن کی نسبت میں تفتیش کر چکا ہوں۔ بقیہ آٹھ کا اور پتہ لگاتا ہے۔ ان انیس ۱۹ میں سے سوائے ایک یعنی مسٹر مارننگ کے اس بات کا ہر ایک میں پتہ چلتا ہے کہ ان کا دنیا میں نہ کوئی دوست تھا نہ عزیز۔ تنہا رہتے تھے۔ اور عام طور پر ہر شخص کی محلہ والوں سے اَن بن رہتی تھی۔

بس سوائے اس کے اور کوئی سراغ ایسا نہیں ملتا جس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ان سب کی گم شدگی کسی ایک ہی راز سے تعلق رکھتی ہے"!

کچھ دیر رک کر مسٹر ریڈر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بیان کیا۔

"ہاں ایک امر اور بھی قابلِ غور ہے۔ ان لوگوں کی گمشدگی کے بعد کوئی رقم ان لوگوں کے نام سے نہیں آئی۔ البتہ مسز مارٹنگ کے نام دو ایک مرتبہ اس کی عدم موجودگی میں یہ رقم ضرور آئی۔ لیکن ان کے آخری سفر کے بعد یہ صورت بھی جاتی رہی"۔

افسر پولیس نے پھر حیرت سے سوال کیا۔

"لیکن واقعی تم کو اس کا یقین ہے کہ ان لوگوں کی تعداد ۲۷ ہے"۔

مسٹر ریڈر نے جواب کی زحمت نہ گوارا کرتے ہوئے جیب سے ایک طویل فہرست نکال کر پیش کر دی جس میں ان گم شدہ لوگوں کے نام اور پتے بالتفصیل موجود تھے۔

"آخر ان لوگوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے"۔ پولیس افسر نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے" مسٹر ریڈر نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ "یہ لوگ ہلاک کر دیئے گئے"۔

آخری فقرہ اس قدر غیر متوقع اور حیرت انگیز تھا کہ پولیس افسر بے اختیار کرسی سے اٹھ بیٹھا اور مسٹر ریڈر کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"ریڈر، آج تمہارا انداز بے حد ظریفانہ ہے۔ میں پھر کسی وقت تم سے اس بارہ میں گفتگو کروں گا۔ کونسی عقل بھلا اسے باور کرے گی کہ یہ لوگ بلا وجہ ہلاک کر دیئے گئے"۔

مسٹر ریڈر بھی اس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ فوراً اپنا ڈنڈا اور چھاتہ سنبھال ٹوپی سر پر رکھ، اور افسر کو سلام کر کے کمرہ سے کافور ہو گئے۔

چونکہ عنفوان شباب سے لے کر اس وقت تک تقریباً ساٹھ برس کی عمر کا زمانہ مسٹر ریڈر کو پولیس اور خصوصاً خفیہ پولیس کی خدمت کرتے ہوئے گزر چکا تھا اور اس طویل مدت میں نہیں معلوم کیسے کیسے اہم مقدمات میں کامیابی حاصل کر چکے تھے اور خدا معلوم کتنے بدمعاشوں اور جرائم پیشہ لوگوں کو سیدھا کر چکے تھے۔ اس لئے رازداری کے باوجود آپ شیطان کیطرح مشہور تھے۔ اور ہر شخص بخوبی آگاہ تھا کہ اس پرانی اور عجیب ساخت کی ٹوپی کے نیچے پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کو حل کرنے کے واسطے ایک غیر معمولی دماغ پوشیدہ ہے۔ اور ناک کے سرے پر رکھی ہوئی عینک کے پیچھے ایک مجرم کو پہچاننے کے لئے کسی معمولی انسان کی آنکھیں نہیں بلکہ عقاب کی آنکھیں ہیں۔

لیکن اس کا علم کہ آپ کس طبیعت کے آدمی ہیں، اور کس چیز سے زیادہ دلچسپی ہے در حقیقت آپ کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس باب میں آپ کے ہر جاننے والے کی رائے مختلف اور ایک دوسرے سے قطعی جدا تھی۔ ایک کہتا تھا کہ اسے دن رات سوائے مقدمات کی تشویش کے دوسرا کام نہیں ہے۔ دوسرے کا خیال تھا کہ اسے اپنی ملازمت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

مجبوراً اپنے فرائض انجام دیتا ہے اور ایک اپنے ہی ایسے انسان کو جیل میں جاتے ہوئے دیکھ کر قلبی افسوس ہوتا ہے۔ جس مکان کو آپ کے مسکن ہونے کا فخر حاصل تھا اس کی مالکہ اپنے دوستوں سے بتبسم بیان کرتی تھی کہ وہ مسٹر ریڈر کی دس بارہ برس سے خدمت کر رہی ہے اور یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہے کہ صنفِ نازک کے معاملہ میں ریڈر انسان نہیں بلکہ ایک سنگی مجسمہ ہے اسے خداوند عالم کی اس قابلِ قدر مخلوق سے دلچسپی تو کجا انتہائی نفرت ہے، مگر دیکھنے والے اس بات کے واسطے بھی کعبہ سر پر اٹھانے کو تیار تھے کہ مسٹر ریڈر باوجود پیر فرطوت ہونے کے بارہ برس سے زیادہ کسی عورت سے مخاطب بھی نہیں ہوتا۔ اور جس کے ثبوت میں وہ لوگ اُنکا اور مس مارگیرٹ بلمین کا اتحاد پیش کرتے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ مسٹر ریڈر عورتوں کی طرف سے کتنے ہی بے حس کیوں نہ ہوں جناب کو مس بلمین سے ایک گونہ دلچسپی ضرور تھی۔ روزانہ آپ کا معمول تھا کہ صبح ساڑھے نو بجے اور شام کو پانچ بجے کے بعد مس بلمین سے ضرور ملتے تھے۔ اکثر موٹر پر آپ مس صاحبہ کے ہمراہ سیر کے واسطے بھی تشریف لے جاتے تھے۔

حسبِ معمول ایک دن آپ مس بلمین کے یہاں ٹیبو بنے ہوئے تشریف فرما تھے، ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں اور آپ اس کمسن شوخ کی دلفریب اداؤں اور باتوں سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہے تھے، باچھیں کھلی ہوئی تھیں، عالمِ بے اختیاری میں عینک عنقریب ناک سے پھسل کر ہونٹ پر آنے والی تھی کہ بات ہی بات میں تعطیل کے موقع پر باہر جانے کا ذکر آگیا۔ مس بلمین نے کہا۔

"دوسری تاریخ کو میں باہر جا رہی ہوں کیونکہ میرے حصہ داری کا منافع پہلی تاریخ کو واجب الادا ہو جاتا ہے۔"

یکایک معلوم ہوا کہ اس نیم مردہ بڈھے کے جسم میں کسی نے بجلی دوڑا دی آنکھیں ضرورت سے زیادہ کشادہ ہو کر چمکنے لگیں۔ دہن مبارک بھی پیاسی چڑیا کے منہ کی طرح کھل کر رہ گیا اور دونوں ہاتھوں سے بے اختیار اپنے ڈنڈا اور چھاتہ کو مضبوط پکڑ لیا۔ حالانکہ جناب کی قوتِ حسیہ نے اس قدر زور کیا لیکن قوت ناطقہ نے صرف اتنی مدد کی کہ زبان سے لفظ "ایں" نکل سکا۔

مس بلمین کو حالانکہ جناب کے اس بے محل استعجاب پر حیرت ضرور ہوئی لیکن اس نے ہنس کر ٹالتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نے کبھی اس بات کا اندازہ نہیں کیا کہ میں بھی ایک متمول عورت ہوں۔ اور میرا تمول مجھے کمپنی کا حصہ دار بنا سکتا ہے، درحقیقت والد کے انتقال کے بعد میں نے مکانات فروخت کر کے دس ہزار پونڈ ایک متدین کمپنی میں لگا دیئے۔ جہاں سے مجھے اب دس پونڈ ماہوار ملا کرتے ہیں۔"

مسٹر بڈر نے جھینپ کو ٹھوڑی کھجلاتے ہوئے کہا۔

"اس حساب سے تو آپ کو تخمیناً ۱۲½ فیصدی منافع ملتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عجیب و غریب کمپنی ہے۔" "اس کمپنی کا نام کیا ہے؟"

مس بلمین نے کسی قدر متامل ہو کر کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔ میں کمپنی کا نام تو نہیں بتا سکتی۔ یہ حقیقتاً کمپنی کا ایک راز ہے۔ تاہم چونکہ تم میرے ایک مخلص ملنے والے ہو اس لئے صرف اس قدر بتا سکتی ہوں کہ یہ ایک امریکن کمپنی ہے جو باغیانہ جماعت کو اسلحہ مہیا کرتی ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ضرور ہے کہ یہ کام غیر آئینی ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو مجھے اس سے کیا سروکار،

تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ ایسا معقول منافع دینے والی کمپنی کو چھوڑ دو بنا حماقت نہیں تو اور کیا کہا جائیگا"۔

"لیکن" مسٹر ریڈر نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "اس قدر رازداری کی ضرورت تو نہ ہونا چاہیئے۔ کتنی ہی کمپنیاں ایسی ہیں جو علانیہ اسلحہ کا کام کرتی ہیں"۔

مس بلیمن کے پاس اس کا بھی کوئی معقول جواب نہ تھا۔ بہت کچھ پس و پیش کے کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ہم حصہ داروں سے اس امر کا نہایت سختی سے معاہدہ لے لیا گیا ہے کہ کمپنی کے اس راز کو کبھی کسی سے بیان نہ کریں گے۔ منافع ہر ماہ پابندی سے آجاتا ہے۔ اور ایک ہزار پونڈ کی رقم سے تین سو پونڈ اب تک وصول ہو چکے ہیں"!

مسٹر ریڈر نے دیکھا کہ زیادہ اصرار کرنا بیکار ہونے کے علاوہ مشکوک بھی بنا دے گا اس لئے خاموش ہو گئے اور دل ہی دل میں اس مسئلہ کو کل پر ملتوی کر دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد مسٹر ریڈر مس بلیمن سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔

× × × × × ×

دوسرے دن مسٹر ریڈر دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک اور آدمی پُر اسرار انداز سے غائب ہو گیا۔ واپسی پر تہیہ کر لیا کہ اس وقت کی ملاقات میں مس بلیمن سے تفصیلی واقعات جس طرح ممکن ہوا ضرور معلوم کرونگا۔ چنانچہ پانچ بجے جب آپ کی مس بلیمن سے ملاقات ہوئی تو آپ نے پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔ مس بلیمن نے کسی قدر جھلا کر جواب دیا۔

"آخر تمہیں اس معاملہ کی اس قدر کیوں کرید ہے۔ بالفرض اگر تم بھی اس کمپنی کے حصہ دار بننا چاہتے ہو تو اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ بھی قطعی ناممکن ہے۔ کیونکہ ہم لوگوں سے اس بات کا بھی عہد لیا جاتا ہے کہ کسی دوسرے کو حصہ دار بننے کی ترغیب نہ دیں گے"۔

یہ خشک جواب سن کر کوئی دوسرا ہوتا تو سپر ڈال کر اعتراف شکست کر لیتا۔ لیکن بڑے میاں اور وہ بھی پولیس کے چھٹے، بھلا کاہے کو باز آنے والے تھے۔ ایک ہاتھ سے ڈنڈا اور چھاتہ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے ٹوپی اتار کر بغل میں دبائی اور صفا چٹ چندیا کو سہلاتے ہوئے بولے۔

"مس بلمین میں تمہیں ایک ایسا واقعہ سناتا ہوں جسے سننے کے بعد اگر تم خائف نہ ہوئیں تو متحیّر ضرور ہو گی"۔

اور اس تمہید کے بعد جناب نے مفصل واقعات یکے بعد دیگرے ان گم شدگیوں کے بیان کر دیئے اور آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ ان جملہ واقعات میں یہ بات ہر واقعہ کے متعلق بیان کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کو ایک خاصی رقم ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ملا کرتی تھی۔

مس بلمین کی رنگت زرد پڑ گئی۔ نہایت خوفزدہ لہجہ میں بولی۔

"اس کمپنی کا نام میکسکو سٹی انوسٹمنٹ سنڈیکیٹ ہے اور اس کا دفتر پرنگال اسٹریٹ میں واقع ہے"۔

"میں مشکور ہوں" مسٹر ریڈر نے کہا۔ "یہ تو بتاؤ کہ تمہیں اس کی اطلاع کیوں کر ہوئی"۔

"میرے پاس ایک خط آیا تھا۔" مس بلمین نے بیان کیا۔ "جس میں مینجر مسٹر ڈی سلوا کے دستخط تھے اور لکھا تھا۔ کہ اُسے میرے ایک دوست سے معلوم ہوا ہے کہ میں اپنے سرمایہ کو کسی کمپنی میں لگانا چاہتی ہوں۔"

"کیا تمہارے پاس وہ خط ہے" مسٹر بیڈر نے دریافت کیا۔

"نہیں" مجھے تاکیداً لکھا گیا تھا کہ میں اس خط کو ضرور ہمراہ لیتی آؤں، حالانکہ لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں مینجر سے کبھی نہ مل سکی۔ البتہ کمپنی کے قانونی میشروں کا ضرور ایک خط آیا تھا جو غالباً میرے پاس محفوظ ہے۔ آپ ٹھہریئے میں اس خط کو لاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر مس بلمین نے دوسرے کمرہ سے لاکر مسٹر بیڈر کو ایک خط دیا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"مکرمہ تسلیم۔ ہم لوگ میکسکو سٹی انوسٹمنٹ کمپنی کے قانونی مشیر ہونے کی حیثیت سے آپ کو اس بات کا اطمینان دلا سکتے ہیں۔ کہ یہ کمپنی نہایت بہترین اور اعلیٰ پیمانہ پر کام کرنے والی ہے۔ مالی حالت ہر طرح قابلِ اطمینان ہے اور ہم لوگوں کے علم میں تمام موجودہ کمپنیوں سے زیادہ منافع دینی والی ہے۔ فقط"

بریچر اینڈ بریچر

خط پڑھنے کے بعد مسٹر بیڈر نے سوال کیا۔

"تم کہتی ہو کہ تم نے اس کمپنی کے مینجر کو کبھی نہیں دیکھا"۔

"کبھی نہیں" مس بلمین نے جواب دیا۔ "جب میں مینجر سے ملنے گئی تو دفتر میں صرف ایک کلرک تھا۔ جس نے بیان کیا کہ مینجر باہر گئے ہوتے ہیں۔ مجبوراً میں

نصاب میں دیکر چلی آئی۔ اور چونکہ اسی عمارت میں بریچر اینڈ بریچر کا بھی دفتر ہے اسی لئے میں مسٹر بریچر سے البتہ مل سکی۔ سچ پوچھو تو جس چیز نے مجھے اس کمپنی کا حصہ دار بننے کے واسطے مجبور کیا وہ یہ تھی کہ میں جب چاہوں تین یوم کے اندر اپنا سرمایہ واپس لے سکتی ہوں۔ دوسرے دن میں نے حصہ کا روپیہ روانہ کر دیا۔ اور جب سے حسب وعدہ منافع برابر مل رہا ہے۔ ایسی صورت میں میرا تو خیال ہے کہ مسٹر ریڈر آپ کو کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ آپ گم شدگیوں کو اس کمپنی سے متعلق ہونے کا شبہ کرتے ہیں۔"

مسٹر ریڈر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دن بعد دوپہر پرتگال اسٹریٹ پر مسٹر ریڈر نے تھوڑی سی تلاش کے بعد کمپنی کا دفتر پالیا۔ سوائے ایک کلرک کے اور کوئی نہ تھا۔ جس نے بیان کیا کہ مینجر باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور آج ملاقات نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ کام ہو لکھکر رکھ دیجئے۔ مسٹر ریڈر نے جواب دیا۔ کوئی ضروری کام نہ تھا۔ اور باہر چلے آئے۔ اسی دفتر کے بالکل مقابل چونکہ بریچر اینڈ بریچر کا دفتر تھا۔ اس لئے مسٹر ریڈر نے مسٹر بریچر ہی سے ملاقات کو غنیمت سمجھا۔ اور چند منٹ میں آپ مالک فرم مسٹر بریچر کے کمرے میں پہنچا دیئے گئے۔ نہایت اختصار کے ساتھ مسٹر ریڈر نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ جس کے جواب میں مسٹر بریچر نے کہا۔

"یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ آپ آج ہی تشریف لے آئے۔ ورنہ شاید ہم لوگ قانوناً اس کمپنی کے متعلق جواب دینے کے ذمہ وار نہ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ اب ہم اس کمپنی کے قانونی مشیر ہونے سے مستعفی

ہو جائیں گے۔ کیونکہ کمپنی مذکور کے ہر حصہ دار کو جواب دیتے دیتے ناک میں دم ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے کام میں بہت حرج ہوتا ہے۔"

"کیا آپ کے پاس" مسٹر ریڈر نے دریافت کیا۔" ان حصہ داروں کی کوئی فہرست ہے۔ جن کو آپ نے جواب دیا ہے۔"

"درحقیقت" مسٹر بریچر نے جواب دیا۔" یہ بات اور بھی ہماری بددلی کا سبب ہو گئی ان حصہ داروں کی فہرست پرسوں ہمارے دفتر سے نہایت پر اسرار انداز سے غائب ہو گئی۔ اس لئے ہم آپکی تعمیل ارشاد سے مجبور ہیں۔"

اس جواب کے بعد رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ مجبوراً مسٹر ریڈر نے مسٹر بریچر سے مصافحہ کیا اور دفتر سے باہر آکر غور و فکر میں ہمہ تن مستغرق آپ نے اس ہیئت سے مکان کا رخ کیا کہ ٹھوڑی سینہ پر۔ ڈنڈا بغل میں اور چھاتہ دونوں ہاتھوں میں پیچھے گھسٹتا ہوا۔ جس سے دیکھنے والوں کو گمان ہوتا تھا کہ کوئی عجیب الخلقت جانور اپنی دم گھسیٹتا ہوا آہستہ آہستہ اپنے مکان پر جا رہا ہے۔

اس روز شام کو انتہائی انتظار کے باوجود مس بلین سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مسٹر ریڈر نے مجبوراً رات کو اس دفتر کے مینیجر کو مکان پر ٹیلیفون کیا۔ جہاں مس بلین ملازم تھی۔ جواب ملا کہ ۴ ½ بجے مس بلین کو کسی نے ٹیلیفون کیا اور اسی وقت وہ اجازت لے کر دفتر سے چلی گئی۔ اس رات کو مسٹر ریڈر مکان بھی نہیں گئے۔ اور تمام رات خفیہ پولیس کے دفتر میں بیٹھ کر گزار دی۔ جب صبح بھی مس بلین کا کوئی سراغ نہ لگا۔ تو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ مس بلین کا نام بھی گم شدہ لوگوں کی فہرست میں داخل کرنا پڑے گا۔

صبح آٹھ بجے آپ مکان پہنچے اور منہ ہاتھ دھو کر کچھ ناشتہ کیا۔ اور پھر دفتر آگئے افسر پولیس کے آنے پر مس بلمین کی گم شدگی کا واقعہ بیان کیا۔ جسے سُن کر افسر نے سوال کیا۔

"کیا تم واقعی کمپنی کے منیجر کو ان گم شدگیوں سے متعلق سمجھتے ہو؟"

"یقینی" مسٹر بیڈر نے جواب دیا۔" اب مجھے اس معاملہ میں کامیابی کی صرف ایک امید ہے۔ جو بد قسمتی سے نہایت کمزور ہے۔ اور جسے میں ابھی آپ سے بیان بھی نہ کروں گا۔"

مسٹر بیڈر افسر پولیس سے رخصت ہو کر سیدھے کمپنی کے دفتر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ منیجر صاحب آج بھی واپس نہیں آئے۔ دفتر سے رخصت ہو رہے تھے کہ آپ نے دیکھا مسٹر بریچر مع اپنے بھائی کے دفتر کے باہر کھڑے ہیں۔ مسٹر بیڈر نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"چونکہ آپ لوگ اس کمپنی کے قانونی مشیر ہیں۔ اس لئے میں آپ کو بھی مطلع کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ میں یہاں ایک پولیس کا آدمی تعینات کئے دیتا ہوں تاکہ وہ اس کمپنی کے منیجر کو جس وقت وہ آئے فوراً حراست میں لے لے۔"

"کیوں، خیریت" مسٹر بریچر نے گھبراتی ہوئی آواز میں متحیر ہو کر سوال کیا۔ "آخر اس حراست کا کیا سبب ہے۔"

"مجھے خود نہیں معلوم" مسٹر بیڈر نے جواب دیا۔" کہ کون سا جرم منیجر پر لگایا جائے گا لیکن یہ یقینی ہے کہ جو جرم بھی ہوگا وہ نہایت زبردست اور سنگین ہوگا۔ اور منیجر کو اپنی بریت کیواسطے انتہائی قابل اطمینان شہادت پیش کرنا ہوگی۔ ورنہ

مقدمہ سے چھٹکارہ پانا محال ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہوگا۔"

"تعجب ہے کہ ہم لوگوں کو منیجر کی کسی غیر آئینی حرکت کا قطعی کوئی علم نہ ہوسکا کیا آپ بتا سکتے ہیں" مسٹر بریچر نے معاملہ سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "کہ یہ کمپنی محض دھوکا تو نہیں ہے"

"میرا خیال تو یہ ہے کہ شاید اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دھوکے باز کمپنی آج تک عالم وجود میں نہ آئی ہوگی"

اسی دن تقریباً آٹھ بجے رات کو جب کہ مسٹر ریڈر اپنے دفتر سے مکان جا رہے تھے ایک موڑ پر ایک موٹر نہایت تیزی سے سمت مخالف سے آکر ان کے پاس سے گزر گئی۔ لیکن چند قدم جاکر رک گئی اور کسی نے ان کا نام لے کر آواز دی۔ مسٹر ریڈر نے گھوم کر دیکھا تو ایک آدمی موٹر سے ہاتھ ہلا کر انہیں بلا رہا تھا۔ یہ پلٹ کر گاڑی کے پاس پہنچے۔ جب تک آدمی بھی موٹر سے باہر آچکا تھا۔ اب جو غور سے دیکھا تو مسٹر بریچر کا چھوٹا بھائی جوزف نہایت سراسیمگی اور خوف سے کانپ رہا ہے۔ گھبرائے ہوتے لہجہ میں بولا۔

"ہم لوگوں نے منیجر کو پالیا ہے، میرے بھائی نے بہت کچھ دم دلاسا دے کر اصل حقیقت معلوم کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوسکی۔ تاہم جو کچھ معلوم ہوا وہ اس قدر غیر معمولی اور حیرت انگیز ہے۔ کہ اپنے ہوش و حواس قائم رکھنا دشوار ہے۔"

"آخر وہ کمبخت ہے کہاں" مسٹر ریڈر نے سوال کیا۔

"ابھی ابھی" بریچر نے جواب دیا۔ "جبکہ ہم دونوں بھائی کھانے کے کمرہ میں

جانے والے تھے کہ وہ مکان پر آیا۔ میرے بھائی نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس معاملہ کو چھیڑ دیا۔ لیکن اُس نے اصل حقیقت کا اظہار ہنوز نہیں کیا۔ میرے بھائی نے دوسرے کمرہ میں آکر مجھے ہدایت کی کہ میں فوراً آپ کو بلا لاؤں۔ اُس وقت تک وہ کسی حیلہ سے اُسے روکے رہیں گے"۔

مسٹر ریڈر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ڈنڈا چھانہ سنبھال فوراً موٹر میں بیٹھ گئے۔ جوزف بریچر نے نہایت تیزی سے موٹر چلانا شروع کیا۔ اور چند منٹ میں اپنے مکان کے سامنے پہنچکر روک دی۔ دونوں آدمی مکان میں داخل ہوئے۔ ہنوز مسٹر ریڈر کا ایک پاؤں کمرہ کے باہر ہی تھا کہ جوزف بریچر کے بڑے بھائی آرنسٹ بریچر نے کمرہ کے اندر سے آواز دی۔

"کیا مسٹر ریڈر تشریف لے آئے"؟

"میں حاضر ہوں" کہتے ہوئے مسٹر ریڈر کمرہ میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ مسٹر بریچر آتشدان کا سہارا لئے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ مسٹر ریڈر کو دیکھتے ہی اُسی جگہ کھڑے کھڑے مصافحہ کے واسطے ہاتھ بڑھاتے ہوئے رازدرانہ لہجہ میں بولے "مینیجر کو میں نے آرام کرنے کے لئے اوپر بھیج دیا ہے۔ آپ تشریف رکھیں"

مسٹر ریڈر نے ڈنڈا اور چھانہ بائیں ہاتھ کی گرفت میں دیا اور داہنا ہاتھ بڑھا کر شکاری کتے کیطرح مسٹر بریچر کیطرف لپکے۔ ہنوز بیچارے مصافحہ بھی نہ کرنے پائے تھے کہ جناب کا داہنا پاؤں مسٹر بریچر کے عین سامنے ایک چھوٹے سے چوکور قالین پر پڑا۔ فوراً اپنی ازخود رفتگی میں خطرناک غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن تیر چلگی سے چھوٹ چکا تھا۔ خلا میں گرتے ہوئے اپنے رفیق زندگی ڈنڈے اور

چھاتہ کو بھی خیرباد کہا۔ اور ایک ناکام کوشش کی کہ قالین پوش تہ خانہ کے کنارے ہاتھ میں آجائیں۔ چند لمحوں کے واسطے یہ سہارا بھی مل گیا۔ اور آپ لٹک گئے لیکن فوراً دوسری مصیبت سامنے آگئی۔ دیکھا کہ مسٹر بریچر عنقریب ہاتھوں پر جوتوں کی ضرب لگانا چاہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ لیکن مسٹر ریڈر کے واسطے یہ سہارا بھی نہ رہا۔ قہر درویش برجان درویش، مجبور ہو کر ہاتھوں کو ہٹا لیا۔ اور چشم زدن میں نہیں معلوم کتنے سو فیٹ گہرائی کی پیمائش کرتے ہوئے زمین پر آرہے۔ آپ ہنوز بے قاعدہ انداز سے فرش پر دراز تھے کہ نگاہ اوپر اٹھ گئی دیکھا کوئی گردن جھکائے جھانک رہا ہے۔ فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے لمحہ میں فیر کی آواز سنائی دی۔ پستول کی گولی مسٹر بریچر کے رخسار کا نہایت نازک بوسہ لیتی ہوئی روشندان کے شیشہ کو شہید کر کے نکل گئی۔ مسٹر بریچر گالی دیتے ہوئے پیچھے ہٹے اور ساتھ ہی تہ خانہ کا سوراخ بند ہو گیا۔

سچ ہے انتہائی مجبوری کا نام صبر ہے۔ مسٹر ریڈر گو آغاز ملازمت سے لے کر اس وقت تک کبھی ایسی خطرناک مصیبت میں مبتلا نہ ہوئے تھے پھر بھی نہ چیخے نہ چلائے۔ نہ حرکات و سکنات سے گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار ہوا۔ فیر خالی جانے اور تہ خانہ کا سوراخ بند ہونے پر اپنے پستول کو چپکے سے جیب میں منتقل کر دیا۔ اور دوسری جیب سے ایک چھوٹا سا برقی لمیپ نکال کر اپنے اس قبر نما قفس کا معائنہ شروع کر دیا۔ تہ خانہ خاصہ وسیع اور مستحکم بنا ہوا تھا۔ ایک گوشہ میں کم و بیش دس بارہ سیڑھیوں کا ایک چھوٹا سا زینہ تھا۔ جس کے سرے

پر ایک آہنی دروازہ دوسری جانب سے بند تھا۔ ہنوز یہیں تک معائنہ کرنے پائے تھے۔ کہ آپ یکایک اس طرح گھبرا کے کھڑے ہو گئے کہ جیسے کسی نے جسم میں بجلی کا کرنٹ دوڑا دیا ہو۔ بات صرف اتنی تھی کہ آپ کی پشت کی جانب سے کسی نے باریک آواز میں پکارا۔

"مسٹر ریڈر"۔

گھوم کر برقی لیمپ کی روشنی آواز کی سمت ڈالنا تھا۔ کہ سارا راز کھل گیا۔ دیکھا کہ ایک گوشہ میں نہایت سراسیمہ اور خائف مس ہلین بیٹھی ہے۔

"مجھے افسوس ہے" مس ہلین نے کہا۔ "کہ میں نے آپ کو اس مصیبت میں مبتلا کیا"۔

"تم یہاں کب آئیں"۔ مسٹر ریڈر نے سوال کیا۔

"میں کل رات سے یہاں ہوں"۔ مس ہلین نے جواب دیا۔ "پرسوں ۱/۲ ۱۱ بجے بریچر نے فون کر کے مجھے یہاں بلایا۔ اور ایک کمرہ میں مقید کر دیا۔ اور ایک گھنٹہ ہوا کہ اس زینہ سے یہاں اتار دیا"۔

مسٹر ریڈر کے استفسار پر مس ہلین نے بتایا کہ یہ زینہ مکان کے نیچے والے حصہ کے ایک کمرہ میں کھلتا ہے۔ جہاں باورچی خانہ اور جنس وغیرہ رکھنے کی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ مسٹر ریڈر نے زینہ پر چڑھ کر دروازہ کو دیکھا۔ لیکن اسے جنبش بھی نہ ہوئی۔ نیچے آکر متفکرانہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مسٹر ریڈر نے آپ ہی آپ سوال کیا۔

"آخر ان لوگوں کا منشا کیا ہے؟ اور کیا کرنے والے ہیں"۔

اس سوال کے بعد ہی جو واقعہ ظہور میں آیا۔ وہ اصولاً مسٹر ریڈر کے سوال کا جواب بھی تھا اور جس نے ان دونوں نو اسیروں کے رہے سہے حواس بھی غائب کر دیئے۔ تہ خانہ کے ایک گوشہ سے یکایک پانی کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اور چشم زدن میں پنڈلیوں تک پانی بھر گیا۔ مسٹر ریڈر نے پاکٹ لیمپ سے دیکھا کہ دیوار میں تین چوکور اور کافی وسیع سوراخوں سے پانی نہایت تیزی سے نکل رہا ہے کسی قدر آگے بڑھکر اس کا اندازہ کیا کہ آیا پانی کی رفتار ان سوراخوں میں داخل ہونے کی اجازت دے گی یا نہیں، لیکن ناکامی ہوئی یا پانی اس قوت سے نکل رہا تھا کہ سوراخوں میں داخل ہونا تو کجا ان کے نزدیک بھی پہنچنا دشوار تھا۔ اب پانی رانوں سے اوپر پہنچ چکا تھا۔ مسٹر ریڈر نے مس ہلین کو ہدایت کی وہ زینہ کی آخری سیڑھی پر چلی جائے۔ جس کی فوراً تعمیل کی گئی۔ پانی اپنی معینہ رفتار سے برابر بڑھ رہا تھا۔ یہانتک کہ چند لمحوں میں مسٹر ریڈر کی کمر سے اوپر پہنچ گیا۔ مجبوراً انہوں نے زینہ کی راہ لی اور مس ہلین کے پاس پہنچ گئے۔

"کیا تم تیرنا جانتی ہو" ریڈر نے پوچھا

"بہت اچھی طرح"!

لیکن جو اصل سوال تھا وہ مسٹر ریڈر نے نہیں کیا۔ یعنی کتنی دیر تک تیر سکتی ہو، کیونکہ اب اس بلا سے نجات کا اگر کوئی ذریعہ تھا تو محض یہ تھا کہ اس وقت تک برابر تیرا جائے۔ جبتک کہ دشمنوں کو دونوں کے مرنے کا یقین ہو جائے۔ اور پانی کی واپسی شروع ہو۔ جس کے بعد سوراخ میں داخل ہو کر جہاں خدا لیجائے نکل جائیں۔

مسٹر ریڈر اپنا کوٹ اور مس بلیین اپنا سایہ اتارے آہنی دروازے سے لگے ہوئے تیراکی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ پانی زینہ کی آخری سیڑھی کے قریب پہنچ چکا تھا دونوں تصویر حیرت بنے ہوئے، اس لمحہ کا خوف وہراس سے انتظار کر رہے تھے۔ جب کہ موت وزیست کی زبردست جدوجہد کے واسطے ان لوگوں کو عملی طور پہ آمادہ ہونا پڑے گا۔ کہ یکایک آہنی دروازے کے دوسری سمت نہایت خفیف کھٹکا ہوا۔ جیسے احتیاط سے کوئی سٹکنی ہٹا رہا ہے۔ مسٹر ریڈر نے ہمہ تن گوش ہو کر سننا شروع کیا۔ اور آہستہ سے مس بلیین کو ایک سیڑھی نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ دونوں ہاتھ دروازے پر رکھ کر مسٹر ریڈر نے انتہائی احتیاط کے ساتھ خفیف سا دھکا دیا۔ معلوم ہوا سٹکنی ہٹ چکی ہے اور دروازہ کھل سکتا ہے۔ دوسرے لمحہ ہی دروازہ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ اور مسٹر ریڈر ایک ہاتھ میں پستول لئے کرخت لہجہ میں بولے۔

"اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

آدمی کے ہاتھ سے برقی لیمپ گر گیا۔ مسٹر ریڈر نے فوراً اپنا لیمپ نکال کر آدمی کے چہرہ پر روشنی ڈالی، اور فرطِ حیرت سے قریب تھا کہ اپنا لیمپ بھی گر جاتا کہ آدمی نے اطمینانی لہجہ میں کہا۔

"مسٹر ریڈر۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں آپ کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ بشرطیکہ آپ بھی میرے کام میں حارج نہ ہوں۔"

درحقیقت اس آدمی کا نام ملس تھا۔ جو نقب زنی کے کام میں دور دور اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ مسٹر ریڈر کی بدولت یہ متعدد بار جیل کی سیر بھی کر چکے تھے۔ اور آج

اتفاقیہ پھر سامنا ہو گیا۔ لیکن اسے کیا خبر تھی کہ اس وقت مسٹر ریڈر اسے گرفتار کر کے انصاف کے ہاتھوں میں دینا تو درکنار الٹا اسے انعام کا مستحق سمجھ رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں ہزاروں دعائیں دے رہے تھے۔ آپ نے ہاتھ پکڑ کے مس بلیون کو باہر نکالا اور ملس سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجہ میں دریافت کیا۔

"اچھا بتاؤ کہ تم اس مکان میں داخل کس طرف سے ہوئے"؟

"کھڑکی سے"، ملس نے جواب دیا۔

پانی اب تہ خانہ سے گذر کر اس کمرہ میں بھی آچکا تھا جہاں یہ لوگ کھڑے تھے۔ مسٹر ریڈر نے ملس کو راستہ بتانے کے لئے آگے کیا۔ اور خود مس بلیون کا ہاتھ تھام کر پیچھے پیچھے چلنا شروع کیا۔ باورچیخانہ میں پہنچ کر دیکھا واقعی ایک کھڑکی کا جنگلہ اور بیچ غائب ہیں۔ پہلے ملس اور بعد میں یہ لوگ نیچے اُترے۔ اور سڑک پر پہنچ کر اطمینان کی سانس لیتے ہوئے مسٹر ریڈر نے ملس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آج یہ میری خفیہ پولیس کی زندگی میں پہلا موقعہ ہے کہ میں تمہیں خوشی سے اس مکان میں نقب زنی کی اجازت دیتا ہوں۔ جاؤ اور اپنا کام کرو۔ لیکن یاد رکھو صرف آج کی اجازت ہے۔ کل کے بعد سے کوئی رعایت نہ کروں گا"۔

دوسرے دن صبح کو مسٹر ریڈر نے افسر پولیس سے بیان کیا۔ کہ مکسکو سٹی انوسٹمنٹ کمپنی محض فریب تھی۔ درحقیقت ارنسٹ بریجبر اور جوزف ٹریچر اس نام سے لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔ اور کچھ عرصہ تک فرضی منافع دینے کے بعد حصہ داروں کو عدم آباد کا راستہ دکھا دیتے تھے۔

"لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی" افسر پولیس نے سوال کیا۔
"ان لوگوں نے مس بلمین کو ہلاک کرنے میں اس قدر تاخیر کیوں کی"۔

"میرا خیال ہے" مسٹر ریڈر نے جواب دیا۔ "کہ ان لوگوں کو چونکہ علم ہو چکا تھا کہ مجھے اس لڑکی سے ایک حد تک دلچسپی ہے۔ اس لئے بغیر میرے اس کا ہلاک کرنا خطرہ سے خالی نہیں اور یہی وجہ تھی کہ میری دستیابی تک اس کا قتل ملتوی رکھا گیا"۔

"اور کیا واقعی" آفسر نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ کو مس بلین سے دلچسپی ہے"؟

مسٹر ریڈر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مسکراتے اور چندیا کھجاتے ہوئے کمرہ سے باہر چلے گئے ؎

لوٹا

مولوی مطلوب حسن صاحب یوں تو اپنے حلقہ احباب میں اپنی ظرافت، حاضر جوابی اور مخصوص وضع کے سبب ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہی تھے لیکن جس بات نے انہیں سب سے زیادہ ممتاز بنا رکھا تھا وہ ان کی سنجیدگی اور متانت تھی۔ اگر مولانا نے کسی دوست پر پھبتی کسی تو سارے مجمع کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو جاتا مگر کیا مجال کہ مولوی صاحب کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ہی نمایاں ہو جائے۔ اس پارٹ کو جس حُسن و خوبی سے مولانا نے ذیل کے واقعہ میں ادا فرمایا۔ اسے میرے نزدیک ان کا شاہکار سمجھنا چاہیئے۔

جب میں مولانا کے ہمراہ اوناؤ جانے کے واسطے اسٹیشن پہنچا تو ڈاک گاڑی کے آنے میں کافی دیر تھی۔ ایسی صورت میں عام قاعدہ ہے کہ اسٹیشنوں پر معمولی سے معمولی اشتہار بھی پڑھنے کیواسطے مسافر مجبور ہو جایا کرتا ہے۔ مگر ہمارے مولانا کو اس مشغلہ سے قطعی دلچسپی نہ تھی، بلکہ ایسے موقع پر آپ اپنے ہمسفر سے علٰحدہ ہو جانے کو بھی عین اخلاق سمجھتے تھے۔ چنانچہ میں نے متعدد اشتہارات پڑھنے کے بعد مڑ کر دیکھا

تو مولانا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب چونکہ ٹرین کے آنے میں چند ہی منٹ کی دیر تھی۔ اس لئے پلیٹ فارم پر کافی ہجوم ہو چکا تھا۔ اور مسافروں میں وہ بیداری جو گھبراہٹ اور بدحواسی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے جلد جلد قدم بڑھا کر مولانا کی تلاش شروع کر دی۔ الحمد للہ کہ ابھی دو چار ہی آدمی میرا پاؤں کچلنے پلے تھے اور جوتوں کی پالش کو زیادہ صدمہ نہ پہنچا تھا کہ مولانا کی ہزاروں میں بھی نہ چھپنے والی نورانی شکل نظر آگئی۔ دیکھا کہ جناب انتہائی سکون اور اطمینان سے دونوں ہاتھ اچکن کی جیبوں میں ڈالے بغور کسی چیز کو ملاحظ فرما رہے ہیں۔ میں نے بغیر کچھ کہے چپکے سے برابر کھڑے ہو کر نظر کا پیچھا کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کی نگاہیں بظاہر ایک انگریز کے سفری سامان پر جمی ہوئی ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ خدایا اس سامان میں آخر کونسی جاذبیت ہے جس نے مولانا کو اس قدر بیخود اور مبہوت بنا رکھا ہے۔ اور جب میرا دماغ اس معمّہ کو کسی طرح حل نہ کر سکا تو مجبوراً میں نے مولانا کا شانہ ہلاتے ہوئے دریافت کیا کہ حضرت اس سامان میں قدرت خداوندی کا آخر کون سا ایسا راز بندھا ہوا رکھا ہے جسے آپ تصویرِ حیرت بنے ہوئے ملاحظ فرما رہے ہیں۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مولانا نے مجھے ایک ایسا حکم دیا جس نے مجھے اور زیادہ متحیر بنا دیا۔ لیکن مولانا کے احکام اوّل تو اس قدر قطعی اور نادر شاہی ہوا کرتے تھے جن میں کسی تنقید یا جرح کا خفیف ترین ارادہ بھی آپ کی انتہائی ناراضگی اور بدمزگی کا سبب بن جاتا تھا۔ دوسرے اب اس کا وقت بھی نہ تھا۔ اس لئے مجبوراً مجھے خادمانہ انداز سے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا۔ آپ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نہایت متین لہجہ میں فرمایا "ہم لوگوں

کے پاس سکنڈ کلاس کے ٹکٹ تو موجود ہی ہیں لیکن ہم لوگ اسی درجہ میں بیٹھیں گے جس میں یہ سامان رکھا جائے گا۔ دیکھو ہم لوگ دورانِ سفر میں ایک دوسرے سے قطعی اجنبی رہیں گے۔ خبردار میرے کسی طرزِ عمل پر ہنسنا اور نہ کچھ بولنا۔ اوناؤ پہنچ کر تم فوراً اتر جانا اور میرا انتظار کرنا۔ دیکھو وہ ٹرین آگئی۔ بس اب ہم ایک دوسرے سے نا آشنا ہیں۔"

میں مولانا سے چند قدم کے فاصلہ پر کھڑا ہو گیا، اور دل میں غور کرنے لگا کہ آج معلوم ہوتا ہے مولانا نے انگریزوں سے مذاق کی ٹھہرائی ہے۔ انجام کا خدا ہی حافظ ہے۔ ٹرین آکر رکی اور حسبِ معمول پلیٹ فارم ایک چھوٹا موٹا میدانِ حشر بن گیا۔ مسافروں کی بدحواسی۔ قلیوں کی بھاگ دوڑ۔ پلندوں کی پھلینکا پھینکی سودے والوں کی چیخ و پکار۔ گارڈ صاحب کا اطمینان عموماً میرے ایسے بیک بینی و دو گوش سفر کرنے والوں کے واسطے ایک گونہ دلچسپی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر میرا مرکزِ نظر سوائے دو چیزوں کے اور کوئی نہ تھا۔ ایک مولانا اور دوسرا وہ پُر اسرار سامان جس پر مولانا کی نظریں ہنوز اس طرح جمی ہوئی تھیں جس طرح بلّی چوہے کو دیکھتی ہے۔ خدا خدا کر کے انتظار کی صبر آزما گھڑیاں ختم ہوئیں اور سُرخ فلالین کی پٹی سے کمر بستہ ایک خدمت گار نے جملہ سامان سکنڈ کلاس میں رکھا جو اتفاقاً بالکل خالی تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ سامان غائب ہو جانے پر مولانا نے گھوم کر ویٹنگ روم کے دروازہ پر مسمریزم کرنا شروع کر دیا۔ یہ عمل بھی ختم ہوا۔ ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور ایک انگریز نما ہندوستانی صاحب سوٹ بوٹ سے درست۔ ٹائی کالر سے آراستہ۔ سر پر فلیش کی ٹوکری رکھے۔ دہن مبارک میں چلبی حُقّہ

ڈبائے برآمد ہوئے۔ خدمت گار نے لپک کر ایک انگریزی اخبار ہاتھ میں دے دیا۔ جسے انتہائی شانِ خودداری کے ساتھ لیتے ہوئے جناب انگریز صاحب درجہ میں داخل ہو رہے تھے کہ حضور کی نظر ایک لوٹے پر پڑ گئی جو جملہ ساز و سامان میں بالکل چھٹیل نظر آ رہا تھا۔ چونکہ جناب کی پُشت پلیٹ فارم کی جانب تھی اس لئے میں چہرہ کا اتار چڑھاؤ تو نہ دیکھ سکا لیکن حضرت کے تنفر اور برہمی کا اس سے ضرور اندازہ ہو گیا۔ کہ پائے نازکی ایک ہی ٹھوکر میں میاں لوٹے خاں سرنگوں ہو گئے۔ اور لڑھکتے ہوئے بنچ کے نیچے دور جا کر ٹونٹی کے بل ٹک گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر صاحب بہادر پلیٹ فارم کی طرف والی سیٹ پر بیٹھ گئے اور اخبار کا مطالعہ فرمانے لگے۔

اب ہمارے مولانا نے بھی پینترا بدلا اور چپکے چپکے رینگتے ہوئے گربہ مسکین بنے درجہ میں داخل ہو کر صاحب بہادر کے مخالف سمت والی سیٹ پر سُکڑ کر بیٹھ گئے۔ جب یہ تمام مراحل ختم ہو گئے اور گارڈ صاحب نے ٹرین کو روانگی کی اجازت دی تو میں بھی گاڑی میں دونوں حضرات سے علیحدہ ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور بے چینی سے انتظار کرنے لگا کہ دیکھوں مولانا اور صاحب بہادر کی کیسی نپٹتی ہے۔ الحمدللہ کہ انتظار کی زیادہ زحمت نہیں اٹھانا پڑی اور مولانا نے کھیل شروع کر دیا۔ ابھی ٹرین گنگا کے پل تک بھی نہ پہنچی تھی کہ مولانا اپنی جگہ سے اٹھے اور بیچ والی سیٹ کا چکر کاٹتے ہوئے صاحب بہادر کے سامنے دونوں ہاتھ زیر ناف باندھ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ حسب معمول مولانا کی شکل وصورت بلکہ ہر ہر انداز میں بلا کی مسکینیت اور غضب کی سنجیدگی موجود تھی۔ لیکن اس

کے باوجود متحیر تھا کہ الٰہی آخر یہ کیا ہے اور اب اس کے بعد کیا ہوگا۔ تھوڑی دیر تک تو صاحب بہادر بے پرواہ نہ کی اور اخبار بینی میں مستغرق رہے۔ مگر جب مولانا اپنی جگہ پر قطب مینار ہو کر رہ گئے تو مجبوراً صاحب بہادر نے اخبار کو نیچے اور نظروں کو اوپر کیا۔ مولانا نے بھی فوراً قیام کو برطرف کرتے ہوئے رکوع فرمادیا۔ اور مودبانہ انداز میں بولے "حضور کہاں تشریف لے جائیں گے"۔ صاحب بہادر کو اگر اب تک مولانا کے بے وقوف ہونے میں شبہ تھا تو اب یقین ہوگیا۔ لیکن بیچارے کہہ ہی کیا سکتے تھے۔ مولانا کی مسکین صورت زبان سکوت سے پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اگر اس بے تکے سوال نے آپ کو ذرا بھی صدمہ پہنچایا ہے تو آپ جو سزا چاہیں دے سکتے ہیں۔ صاحب بہادر نے غور سے مولانا کی صورت دیکھی اور لاپرواہی سے یہ کہتے ہوئے کہ فیض آباد جا رہا ہوں پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔ مولانا بھی کچھ کہتے ہوئے اپنی جگہ پر آرہے۔ ابھی بمشکل تین چار منٹ گزرے ہوں گے۔ کہ مولانا پھر اپنی جگہ سے اٹھے اور بدستور صاحب بہادر کے سامنے استادہ ہوگئے۔ اس مرتبہ صاحب بہادر نے مخاطب ہونے میں دیر نہیں کی اور مولانا اچھی طرح نیت بھی نہ باندھنے پائے تھے کہ رکوع میں جانا پڑا اور دست بستہ عرض کیا "حضور فیض آباد میں کس عہدے پر ممتاز ہیں"۔ صاحب بہادر نے کسی قدر منہ بناتے ہوئے فرمایا "میں وہاں منصف ہوں"۔ اس جواب کے ساتھ مولانا بالکل دہرے ہوگئے۔ سر کو نعد زور سے جنبش دیتے ہوئے بولے "بڑی مسرت ہوئی۔ خدا حضور کو سلامت رکھے اور اس سے زیادہ ترقی دے"۔ اور پھر اپنی جگہ پر آ گئے۔ اب ٹرین مگروارہ

اسٹیشن کے قریب پہنچ رہی تھی اور میں ہنسی کو روکنے میں قریب قریب ناکام ہو چکا تھا۔ دل میں کہہ رہا تھا کہ خدایا کسی طرح اوناؤ اسٹیشن آجائے۔ اور اس کشمکش سے نجات ملے کہ مولانا کے جسم نحیف میں پھر حرکت ہوئی اور چند ساعت میں صاحب بہادر کے سامنے موجود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب مجھ پر غلبۂ ہنسی کے بجائے خوف طاری ہو رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ صاحب بہادر نے مولانا کے اب لات جڑی اور اب جڑی۔ لیکن ایک طرف اگر مولانا کی جسارت قابلِ داد تھی تو دوسری طرف صاحب بہادر کا ضبط و تحمل بھی قابلِ تحسین تھا۔ حسب دستور سابق طرفین سے مخاطب ہونے کا الکٹنگ ہوا اور مولانا نے اُسی مخصوص انداز میں پوچھا "حضور کا اسم مبارک"۔ جواب میں صاحب بہادر "محمد نعیم" کہتے ہوئے اخبار بینی میں مصروف ہو گئے۔ اور مولانا "سبحان اللہ۔ سبحان اللہ، کیا پیارا نام ہے" کہتے ہوئے اپنی جگہ پر آ رہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مولانا صاحب بہادر کی زد سے بال بال بچ گئے۔ اور یقین کر لیا کہ مولانا کے مذاق کا یہ آخری حملہ بھی بحمد اللہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ اور اوناؤ کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ میں مولانا کی اس کامیابی پر مبارکباد دینے کے لئے عمدہ عمدہ الفاظ تلاش کر رہا تھا اور مولانا اور صاحب بہادر دونوں کی طرف سے مطمئن ہو کر ٹرین سے باہر جلد جلد گزرنے والے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر مولانا اپنی جگہ سے رینگتے نظر آئے۔ الہی خیر،

یہ واقعہ ہے کہ اب مجھے مولانا کیطرف سے قطعی ناامیدی ہوگئی اور اس نازک وقت کا بے چینی سے منتظر تھا جب کہ صاحب بہادر کی ایک زبردست ٹھوکر میں مولانا چاروں شانے چت فرش پر دراز ہونے والے تھے۔ میں دل میں غور کر رہا تھا کہ خدانخواستہ جب یہ سانحہ پیش آئے گا۔ تو پہلے مجھے مولانا کا نیم مردہ جسم اٹھانا چاہیئے۔ یا صاحب بہادر سے لڑنا چاہیئے اور ہنوز کوئی فیصلہ نہ کرسکا تھا کہ مولانا صاحب بہادر کے سامنے پہنچ گئے۔ جن پر اب مجھے ایک مسافر کے بجائے مولانا کے ملک الموت ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ صاحب بہادر نے نہایت چیں بجبیں ہوکر مولانا کی طرف دیکھا۔ اور کچھ کہنے ہی والے تھے کہ مولانا نے اپنے مخصوص لہجہ میں کھیسیں نکالتے ہوئے فرمایا "حضور اگر اجازت دیں تو اوناؤ اسٹیشن پر حضور کے لوٹے سے وضو بنالوں۔" جس کے جواب میں خدا کا شکر ہے کہ صاحب بہادر نے بصورت رضامندی صرف گردن ہلادی اور زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ادھر مولانا ہزاروں دعائیں دیتے اور کلمات تحسین و آفرین فرماتے ہوئے اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔

اوناؤ اسٹیشن آگیا۔ میں حسب الحکم جناب مولانا ممدوح ٹرین سے اتر آیا۔ اور ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوگیا جہاں سے میں بخوبی ان لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔ بنچ کے نیچے سے مولانا نے لوٹا نکالا اور غسل خانے سے پانی لے کر ٹرین سے باہر آئے اور علیٰ درجہ کے سامنے پلیٹ فارم پر بیٹھ کر وضو سازی میں مصروف ہوگئے۔

مجھے مولانا کے بے تکلف دوست ہونے کا ایک عرصہ سے فخر حاصل تھا۔

مگر صورتاً مولوی ہونے کے علاوہ سیرۃً انکے مولوی ہونے کا ثبوت میری نظر سے کبھی نہیں گزرا۔ سوائے عیدین کی نماز کے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مولانا نے جمعہ کی نماز کے لئے بھی زحمت گوارا کی ہو۔ ایسی حالت میں مجھے حیرت اور سخت حیرت تھی کہ خدایا اس وقت مولانا کا یکایک نماز کی تیاری کرنا آخر کیا معنی رکھتا ہے۔ بہرحال راز جو کچھ بھی ہو، مولانا کا وضو بننے لگا اور ماشاءاللہ اس اہتمام اور اطمینان کے ساتھ کہ پورے پانچ منٹ صرف ہاتھ دھونے میں تشریف لے گئے۔ اور ٹرین ٹھہرنے کا وقت ختم ہوگیا۔ پہلی گھنٹی کے بعد ہنوز مولانا گلا ہی صاف فرما رہے تھے۔ کہ گارڈ نے سیٹی دی۔ مگر اللہ رے انہماک عبادت مولانا کو خبر بھی نہ ہوئی۔ حتّٰی کہ ٹرین نے رینگنا شروع کیا۔ یکایک صاحب بہادر نے گھبرا کر اخبار ایک طرف پھینکا اور کھڑکی سے باہر سر نکال کر بوکھلائی ہوئی آواز میں بولے۔

"اجی حضرت لوٹا تو لائیے۔ ارے لوٹا۔ ہائیں یہ کیا اجی لوٹا"۔

ایک پولیس کانسٹیبل سے جو پاس ہی کھڑا تھا مخاطب ہوکر اور مولانا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

"دیکھو جی اس بدمعاش آدمی کو گرفتار کرو یہ میرا لوٹا لئے جا رہا ہے"۔

کانسٹیبل نے گھوم کر مولانا کی طرف دیکھا ہی تھا کہ مولانا نے نہایت اطمینان سے تبسم فرماتے ہوئے کہا۔

"دیکھا میاں اس فیشن ایبل زمانہ میں ایک سیدھے سادے بہنوئی کی یہ قدر ہوتی ہے"۔

صاحب بہادر کیطرف ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے۔

"اس ستم ظریفی کا جواب تجھے تو کیا البتہ تیری بہن کو دونگا۔ ابے مسخرے اُس وقت پولیس کو نہ بلایا جب دن دہاڑے ہزاروں کے سامنے تیری باجی جان کو لے بھاگا تھا۔"

یہ سُن کر کانسٹیبل اور آس پاس کے لوگوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور مولانا وضو سے فارغ ہو کر لوٹا ہاتھ میں لئے اکڑتے ہوئے اسٹیشن سے باہر آگئے۔

* * * * * *

ایفائے عہد

رائے سنگھ رات کے سناٹے میں چہار دیواری پھاند کر پائیں باغ میں اتر گیا، نہایت ہوشیاری سے اِدھر اُدھر دیکھتا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا اس مقام کی طرف بڑھا جہاں سردار جنگ سنگھ کی لڑکی رمبھا اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

رات کے بارہ بجے تھے۔ چاروں طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ ہوا بالکل بند۔ فضا حبس اور گرم تھی۔ پائیں باغ کے وسط میں رمبھا نہایت مضمحل کسی شدید فکر میں جھولے پر بیٹھی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چاند کی روشنی میں حدِ نظر تک اس کی نگاہیں کسی کو تلاش کرنے کے بعد مایوس واپس آجاتی تھیں۔ یکایک قدموں کی آہٹ سُنکر وہ چونکی۔ بے چین نظریں آواز کی سمت اٹھیں۔ دیکھا کہ رائے سنگھ سامنے آرہا ہے۔ جھولے سے اتر کر رمبھا تیز گام چلتی ہوئی آگے بڑھی اور چشم زدن میں دونوں عشق و

محبت کے مجسمے ایک دوسرے کی آغوش میں تھے

چاند کی روشنی میں رائے سنگھ نے دیکھا کہ رمبھا کا چہرہ اترا ہوا اور آنکھیں پرنم تھیں۔ گھبرا کر پوچھا۔

"رمبھا خیریت تو ہے۔ تم اس قدر ملول کیوں ہو۔"

"رائے!" رمبھا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ہماری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ آج میری شادی جے مل کے ساتھ طے ہو گئی۔"

"کیا جے مل کے ساتھ" رائے سنگھ نے متحیر ہو کر کہا۔ "غلط ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کہاں تم اور کہاں جے مل، ساٹھ برس کے بڈھے اور بیس برس کی لڑکی کا کیا جوڑ!"

"یہ ٹھیک ہے، لیکن آپ اس سے بھی واقف ہیں کہ لڑکیوں کی قسمت ان کے والدین کی خواہش پر موقوف ہوتی ہے۔ ورنہ میاں بیوی کے جوڑ کا اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ شادی کے بعد جو لڑکا مجھے ملنے والا ہے وہ بھی ماشاءاللہ مجھ سے کم از کم دس پندرہ برس بڑا ہے۔"

"ہاں، اودے چند۔ وہ میرا ساتھی افسر ہے۔ لیکن تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔"

"اس ناخوشگواری کا بھی مجھے علم ہے۔ سبب یہ ہے کہ شہنشاہ کی نظروں میں آپ کی زیادہ وقعت ہے۔ اس لئے اودے چند آپ سے حسد رکھتا ہے۔"

"خیر مجھے اس کے حسد اور کینہ کی پرواہ نہیں۔ شہنشاہ اکبر کے انصاف پر مجھے پورا اطمینان اور بھروسہ ہے۔"

"رائے" رمبھا نے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔" اب یہ بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ ایک طرف اگر میری غیرت قومی اور نجابت خاندانی والدین کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لئے مجبور کر رہی ہے۔ تو دوسری طرف آپ کی محبت اس ارادے سے باز رہنے کے واسطے دامن کش ہے۔ عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ اس سے قطع نظر ایک خیال ابھی سے سوہان روح ہو رہا ہے۔ اگر میں آپ کی محبت کو نظر انداز کرنے میں کامیاب بھی ہو جاؤں تو جے مل کی عمر کو دیکھتے ہوئے کسی حد تک یقینی ہے کہ مجھے داغ بیوگی نصیب ہوگا۔ ایسی صورت میں مجھے اُس کے ساتھ ستی ہونا پڑے گا۔ جس کا خیال بھی مجھے لرزہ براندام کر رہا ہے۔ پھر آپ ہی تبلایئے میں کیا کروں۔ سوائے زہر کھا لینے کے اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔"

" رمبھا۔ تم ایک بہادر گھرانے اور بہادر افسر کی لڑکی ہو۔ اتنا بزدل ہونا تمہارے لئے کسی طرح زیبا نہیں۔ دل مضبوط کرو۔ سر دست میرا خیال چھوڑو اور اپنے والدین کے فیصلہ سے روگردانی کرنے کا ارادہ نہ کرو جے مل کی طبیعت اپنے بیٹے سے مختلف ہے۔ وہ تمہاری ناز برداری میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ رہا ستی کا مسئلہ۔ خدانخواستہ اگر وقت آیا۔ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جہاں اور جس حال میں ہونگا۔ تمہاری مدد کے واسطے آؤں گا۔ اب رات زیادہ ہو چکی ہے۔ جاؤ۔ خدا حافظ۔

× × × × ×

جے مل اور رمبھا کی شادی ہوگئی۔ اور بلاشبہ باوجود اپنی ضعیفی اور

کمسنی کے چھتے مل نہایت مخلص۔ نازبردار اور بیوی پرست شوہر ثابت ہوا۔ اپنی مقدرت کے بموجب کوئی ایسا عیش و آرام نہ تھا جو رمبھا کے لئے مہیا نہ ہو۔ لیکن سوتیلی ماں پر باپ کی کرم فرمائیاں اودے چند کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھیں۔ اول سوتیلا رشتہ بھی کیا کم تھا۔ اس پر مستزاد اُسے اس کا بھی علم تھا کہ رمبھا کو اس کے شدید ترین دشمن رائے سنگھ سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ اودے چند کو رائے سنگھ سے بے انتہا حسد تھا۔ جس کا سبب رائے سنگھ کی روز افزوں ترقی اور شہنشاہ کی نظروں میں اس کی بڑھتی ہوئی قدر و منزلت تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی۔ رائے سنگھ نہایت وفادار۔ محنتی اور دلیر سپاہی تھا طبعاً وہ بے حد کریم النفس۔ متواضع اور رحمدل الشان تھا۔ جن اوصاف اور خصائل کا اودے چند میں کوسوں پتہ نہ تھا۔ اس لئے ان محاسن کو اپنے اندر پیدا کرنے کے بجائے قدرتاً اس کے دل میں بغض، حسد اور کینہ کا ایک تلاطم برپا تھا۔ اور چونکہ وہ رائے سنگھ کے خلاف ان چیزوں کے بروئے کار لانے میں عاجز تھا۔ اس واسطے اس اوچھی طبیعت کے آدمی نے رائے سنگھ کا انتقام غریب رمبھا سے لینے کا فیصلہ کیا۔

× × × × ×

ایک دن صبح کو چھتے مل اور رمبھا ناشتہ سے فارغ ہو کر برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اودے چند مکان میں داخل ہوا۔ نہ سلام نہ دعا

چہرہ سُرخ۔ آبروؤں پر شکن، اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ زمانہ شناس باپ نے فوراً تاڑ لیا۔ کہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے۔ مشفقانہ لہجہ میں دریافت کیا۔

"کیوں اودے چند خیریت تو ہے۔ کیا معاملہ ہے"۔

"جی کچھ نہیں۔ اپنے مقدر کا رونا ہے"۔

"آخر بات بھی تو معلوم ہو" جے مل نے قدرے سختی سے پوچھا۔

"بات کیا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ کسی خوددار آدمی کا شہنشاہ کی فوج میں داخل ہو کر انصاف و دیانت داری کی توقع کرنا عبث ہے"۔

"کیوں"

"اسلئے کہ آپ ہی ایمان داری سے فرمایئے میں نے اپنے فرائض کو انجام دینے میں کون سی کمی کی۔ کیا میری زیر نگرانی فوج کے بہترین سپاہی نہیں ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ آج رائے سنگھ کو دو ہزار سپاہیوں کا سپہ سالار بنا دیا جاتا ہے اور میری وفادارانہ خدمات پسِ پشت ڈال دی جاتی ہیں۔ کیا یہ کھُلی ہوئی ناانصافی اور حق تلفی نہیں ہے"۔

"یہ تمہاری ناسمجھی اور بچپنا ہے"۔ جے مل نے درشت لہجہ میں کہا۔ "شہنشاہ اکبر کے انصاف پر شبہ کرنا پہلے درجہ کی غلطی ہے۔ آخر میں نے بھی تو ایسی عظیم ترین انسان کے دورِ حکومت میں زندگی کا بہترین حصہ اس کی خدمت کرنے میں گزارا ہے"۔

"گستاخی معاف" بیٹے نے جواب دیا۔ "آپ کو اپنے زمانہ میں گندی

ذہنیت کے انسانوں سے سابقہ نہیں پڑا ہوگا۔ اب صورت یہ ہے کہ رائے سنگھ بے انتہا چاپلوس۔ خوشامدی اور چغل خور آدمی ہے۔ ہر وقت شہنشاہ کو میرے خلاف بھڑکایا کرتا ہے۔ اور یہ کمینہ پن مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"

اودے چند کے الفاظ ابھی ختم نہ ہوئے تھے کہ رمبھا کا غم و غصّہ سے بُرا حال ہو گیا۔ لال پیلی ہو کر بولی۔

"تم غلط کہتے ہو۔ رائے سنگھ پر اس قسم کا الزام لگانا کھُلا ہوا اتہام ہے۔"

جئے مل رمبھا کے اظہارِ خیال پر مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اودے چند نے رمبھا کو نہایت معنی خیز انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ رائے سنگھ کے متعلق کیسی ہی واقفیت کیوں نہ رکھتی ہوں غلطی کا امکان ضرور ہے۔"

"جیسا کہ خود تمہارا حال ہے۔" جئے مل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا۔ اب میں سیر کو جا رہا ہوں، اگر تم چلنا چاہتے ہو تو تیار ہو جاؤ۔"

چند منٹ کے بعد دونوں باپ بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر سیر کو روانہ ہو گئے۔ رمبھا نے برآمدہ سے دیکھا۔ باپ اور بیٹے میں کتنا بین فرق تھا۔ جئے مل باوجود کبر سنی اور ضعیفی کے جوانوں کی طرح گھوڑے پر اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ اور بیٹا جوان ہوتے ہوئے بھی کمر جھکائے ہوئے جا رہا تھا۔

× × × × × ×

ابھی باپ بیٹے کو گھر سے نکلے ہوئے ایک گھنٹہ نہ گزرا ہوگا کہ یکایک باہر سے نوکروں کی گریہ وزاری نے رمبھا کو چونکا دیا۔ متحیر اور گھبرائی ہوئی برآمدہ میں آئی۔ دیکھا کہ دو آدمی ایک چارپائی لئے آرہے ہیں۔ جس پر چھنے لال بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ چارپائی کے برابر اُودے چند سر جھکائے روتا ہوا آرہا ہے۔ دونوں گھوڑوں کو ایک آدمی پکڑے ہوئے ہے۔ اور تمام ملازمین بُری طرح رو رہے ہیں۔ یہ دلخراش منظر دیکھ کر رمبھا کا کلیجہ مُنہ کو آگیا۔ دل تھام کر جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیری ہو گئی۔ اس کا سہاگ موت کے ظالم ہاتھوں سے لُٹ چکا تھا۔ وہی گھر جس کی چند گھنٹے قبل تک وہ زیب و زینت بنی ہوئی تھی۔ اب اس کے در و دیوار بلکہ چپہ چپہ ویران اور سنسان نظر آرہے تھے صرف ایک شخص کے نہ ہونے سے اس کی ساری دنیا برباد اور مٹ چکی تھی۔ اس کا تاج چھن چکا تھا۔ اور اب اس کا وجود سماج کے ناروا آئین کی نظروں میں صفحۂ دنیا پر ایک ناگوار بوجھ تھا۔ کیوں، صرف اس لئے کہ اب وہ بیوہ تھی۔

اس روح فرسا سانحۂ الم کے ساتھ ساتھ ایک اور مصیبت عظمیٰ کا اُسے سامنا کرنا تھا۔ جس کے خیال سے ابھی تک وہ لرزہ بر اندام ہو جاتی تھی۔ اور جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے غریب رمبھا کے پاس بظاہر کوئی حل، کوئی صورت اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ مروجہ آئین قومی کے بموجب ایک عورت کے لئے اس کا بیوہ ہونا ایک بدترین گناہ تھا۔ جس کا کفارہ سوائے اس کے اور کچھ دکھاہی نہیں گیا تھا۔ کہ وہ خود بھی اپنے شوہر کے ساتھ چتا میں بیٹھ کر خاک ہو جائے۔

چنانچہ اس کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اودے چند نے اس واقعہ کی اطلاع جے مل کے اعزا اور احباب کے ساتھ شہنشاہ اکبر کو بھی پہنچائی۔ نیز اُس نے اپنی فوج کے صدر مقام کو اس لئے مطلع کیا کہ اس کی غیر حاضری قابلِ معافی سمجھی جائے۔ اس طرح جے مل کے مرنے کی خبر رائے سنگھ کو بھی مل گئی۔ اور اس پیکرِ خلوص و محبت پر اس اچانک خبر کا اس قدر گہرا اثر ہوا۔ کہ اس کا ساتھی افسر جس نے رائے سنگھ کو یہ اطلاع دی تھی دیکھ کر سخت متعجب اور متحیر ہوا۔ لہجۂ ہمدردی میں کہا۔

"تمہیں اس قدر افسوس نہ کرنا چاہیئے۔ بہر حال جے مل اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکا تھا۔ اور آج نہیں تو کل اُسے یہ دن دیکھنا ضروری تھا۔"

"ہاں۔ میرے دوست یہ صحیح ہے۔ تاہم تم نہیں جانتے کہ یہ خبر میرے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ سردست میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ اور بہت ممکن ہے کہ پھر میری اور تمہاری ملاقات نہ ہوسکے۔"

"آخر تمہارا اس گفتگو سے مطلب کیا ہے"۔ رائے سنگھ کے دوست نے متحیر ہوکر سوال کیا۔" اور تم کہاں جا رہے ہو۔"

"سب سے پہلے تو مجھے شہنشاہ اکبر کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرتے ہوئے اس کے احسانات اور سلوک کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ اس کے بعد چند نجی اور ضروری معاملات طے کرنا ہیں۔ اور پھر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ایک طویل سفر اختیار کرنا ہے۔"

حالانکہ رائے سنگھ کا جواب اس کے دوست کے لئے کسی طرح اطمینان بخش

نہ تھا- بلکہ اس کا تحیّر اور استعجاب اور زیادہ ترقی کر چکا تھا- لیکن داتے سنگھ کا لب و لہجہ اس قدر فیصلہ کن اور قطعی تھا کہ اس کے دوست کو مزید استفسار کی جرأت نہ ہو سکی- اور دونوں دوست ایک دوسرے سے بادل ناخواستہ جدا ہو گئے-

× × × × ×

پانچ میل کی دوری پر جیٹے مل کے مکان میں آخر کار وہ لمحہ جانگسل آ پہنچا جس کے تخیل سے رمبھا کی روح کانپ رہی تھی- اور جس اذیت سے نجات کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی- جیٹے مل کے بے روح جسم کے ساتھ بحیثیت اُس کی بیوہ کے اُسے بھی جل کر خاک ہونا تھا- حالانکہ سماج کے اس اٹل قانون سے رمبھا بخوبی واقف اور باخبر تھی- وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی طرح اگر کسی دوسرے کو اس آئین سے اختلاف بھی ہو- یا خصوصیت سے رمبھا کا شباب- اس کا بے پناہ حُسن اور اس کی معصومیت کسی کے قلب میں غیر معمولی جذبۂ ہمدردی بھی پیدا کر دے- پھر بھی انفرادی حیثیت سے ایک متنفس بھی اس کا مجاز نہ تھا کہ اس موقع پر رمبھا کو سماج کے اس بدترین عذاب سے چھٹکارہ دلا سکے- بظاہر اس کے لئے یہ عبرتناک انجام مقدر ہو چکا تھا- اور اسے اپنی عزیز ترین زندگی کو اسی طرح ختم کرنا تھا- لیکن مثل مشہور ہے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے- اس لئے ان تمام باتوں کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کے لئے تیار ہو گئی- اور جب ستی کی رسم ادا کرنے کے لئے اُسے دلہن بنایا جانے لگا تو اودے چند سے مخاطب ہو کر بولی-

"میں ستی نہیں ہو سکتی، اس شدید ترین موت کا مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں"

اودے چند نے رمبھا کو بغور دیکھتے ہوئے طعنہ زنی کے لہجہ میں جواب دیا۔

"کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا تم اپنا اور سارے خاندان کا نام ڈبونا چاہتی ہو۔ کیا تم اس حقیقت سے ناواقف ہو کہ اس مسئلہ میں ایک بیوہ کی رائے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اُسکی دنیاوی زندگی چونکہ اپنے شوہر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیئے رسم ستی درحقیقت اسی فلسفہ کی ایک عملی صورت ہے۔"

"کیا یہ ممکن نہیں"، رمبھا نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "کہ تم مجھے اس کی اجازت دے دو کہ میں کہیں چلی جاؤں۔ اور بقیہ ایام حیات دیوتاؤں کی پرستش کرنے میں بسر کر دوں۔ اور ایسی گوشہ نشینی اختیار کروں کہ تمام عمر کسی دوسرے مرد کی صورت نہ دیکھ سکوں۔ اگر نظر غور سے دیکھو تو یہ چیز بھی ایک بیوہ کی دنیاوی زندگی ختم کر دینے کے مترادف ہے۔"

"کیا راجہ سنگھ کی صورت بھی کبھی نہ دیکھنے کا عہد کر سکتی ہو۔" اودے چند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا اگر اس کی اجازت نہیں دے سکتے تو اس بات ہی کی اجازت دیدو کہ میں زہر کھا لوں۔ اور ستی ہونے کے عذاب سے بچ جاؤں۔ دنیاوی زندگی ختم کرنے کا مقصد اس طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔ اور یہ مقصد بھی حاصل ہو جائے گا۔ کہ ساری دنیا اس سے باخبر ہو جائے گی کہ جئے مل ایسے بہادر اور دلیر سپاہی نے ایک بزدل عورت سے شادی کی تھی۔ نہیں، کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم کو ستی ہونا پڑے گا۔ اور اگر بخوشی نہیں تو زبردستی تمہیں اس رسم کو ادا کرنے کے لئے آمادہ کیا جائے گا۔"

حسب دستور جےئل کی لاش کو اس کے اعزا اور احباب نے عالیشان چتا پر رکھ دیا۔ جو صندل اور دوسری نہایت قیمتی لکڑی سے تیار کی گئی تھی۔ لاش کے ساتھ ساتھ رمبھا کو بھی نئی دلہن کے کپڑے اور جملہ زیورات پہنا کر ایک مرصع فنس میں مرگھٹ لایا گیا۔ فنس کو چاروں طرف سے اُودے چند کی فوج کے نوجوان سپاہی ننگی تلواریں لئے گھیرے ہوئے تھے۔ جنکی تعداد میں مرگھٹ پہنچ کر اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اور ہر طرف سوائے فوج کے سپاہیوں کے دوسرا نظر نہ آتا تھا۔ بظاہر مسلح سپاہیوں کا اژدہام محض اس لئے تھا۔ کہ وہ اپنے ہر دلعزیز سردار کی آخری رسم میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حقیقت کچھ اس سے مختلف تھی اور اودے چند نے فوج کے تمام چھوٹے چھوٹے افسران اور اپنے ماتحتوں کو باخبر کر دیا تھا کہ اول تو ستی کی رسم ادا کرنے سے خود رمبھا کو شدید اختلاف ہے اور وہ حتی الوسع اس سے جان بچانے کی کوشش کرے گی۔ دوسرے اسبات کا امکان نہیں یقین ہے کہ رائے سنگھ اپنی محبوبہ رمبھا کو عین موقع پر لے بھاگنے کی جدوجہد کرے گا۔ اس لئے اگر یہ صورت پیش آئے۔ تو اس کے ماتحت افسران اور فوج کے سپاہیوں کا یہ فرض ہونا چاہیئے۔ کہ وہ بغیر کسی پس و پیش کے اس کا مقابلہ کریں خواہ اس میں کشت و خون ہی کی نوبت کیوں نہ آجائے۔ بہرحال حرماں نصیب رمبھا کی گلو خلاصی اور جانبری کے تمام امکانات مسدود تھے۔

مرگھٹ پہنچ کر کہاروں نے احترام کے ساتھ فنس کو زمین پر رکھ دیا۔ اودے چند نے لپک کر پردہ ہٹایا اور ہاتھ کا سہارا دے کر رمبھا کو فنس سے اتار لیا۔ حالانکہ اس کی زیب و زینت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن ایسا

معلوم ہوتا تھا۔ کہ سارے کپڑے اور زیورات کسی مردے کو پہنا دیئے گئے ہیں جن کی آرائش وزیبائش دیکھنے والے کی نظر میں بجائے انبساط و مسرت کے رنج و افسوس کی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ رمبھا کے پژمردہ اور نڈھال چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے سارے جسم کے خون کا ایک ایک قطرہ کھینچ لیا گیا ہے۔ اُس کی کھُلی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بالکل بے کیف اور بے نور تھیں۔ جسم کا ایک ایک عضو کسی قلبی خوف کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ قدموں کی ناہمواری پتہ دے رہی تھی۔ کہ غشی کی کیفیت لحظہ بہ لحظہ ترقی کر رہی ہے۔

اُدے چند مضبوط رمبھا کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھا اور آہستہ خرامی سے چتا کی جانب اس کی رہبری کر رہا تھا۔ ایک بار رمبھا نے اس طرح نظریں اوپر اٹھائیں جیسے کہ وہ خاموشی سے اپنے معبودِ حقیقی سے امداد طلب کر رہی ہو۔ لیکن درحقیقت اس کو رائے سنگھ کا وعدہ یاد تھا اور اس کے خلوص و محبت پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے اسکا ضمیر یقین دلا رہا تھا کہ اس آخر وقت میں وہ اس کی اعانت و ہمدردی کے لئے ضرور آئے گا۔ مگر وائے محرومی مرگھٹ تک پہنچنے کے لئے واحد راستہ بالکل خالی تھا۔ رمبھا کی مایوس نظریں راستہ سے واپس ہو کر مرگھٹ کے پجاریوں پر پڑیں جو ہاتھوں میں مشعلیں لئے غیر مانوس زبان میں اشلوک پڑھ رہے تھے۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر رمبھا کے مُنہ سے بیساختہ ایک چیخ نکلی اور نیم بیہوش ہو کر اودے چند کے کاندھوں پر گر گئی۔ اُدے چند نے اپنی گرفت کو اور مضبوط کر دیا۔ اور سپاہیوں کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ جنہوں نے رمبھا کے ہر چہار طرف مضبوط حلقہ بنا لیا۔ رمبھا

کو ہوش آچکا تھا اور وہ آہستہ آہستہ اُدے چند کا سہارا لئے چتا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کہ یکایک ایک سپاہی نے کہا۔

"دیکھو دیکھو کوئی سوار تیزی سے مرگھٹ کی سمت آرہا ہے"۔

سارے مجمع کی نگاہیں راستہ کی طرف اٹھ گئیں۔ واقعی ایک آدمی نہایت تیز رفتار گھوڑے پر مرگھٹ کی طرف آرہا تھا۔ جس کے پیچھے تقریباً چھ سات اور سوار بھی تیزی سے آرہے تھے۔ ان سواروں کی آمد مجمع میں کسی کے واسطے باعث مسرت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ لیکن رمبھا کے واسطے یہ چند نفوس تائید غیبی سے کم نہ تھے۔ سارا خوف و ہراس جاتا رہا۔ اس کے بشرے سے اطمینان و مسرت کا اظہار ہونے لگا۔ بے تابی سے اس نے راستہ کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکراتے ہوئے بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

"رائے"

یہ لفظ سنتے ہی اُدے چند نے قہر آلودہ نظروں سے رمبھا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ رائے سنگھ اور اس کے مٹھی بھر جوان تم کو مرگھٹ سے زندہ اور سلامت لے جائیں گے۔ تو تم غلطی پر ہو، اس چیز کو میں نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا اور یہی سبب تھا کہ میں نے اپنی فوج کے تمام جوانوں کو اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے یہاں طلب کیا ہے۔ جو جان لینے اور جان دینے کے واسطے بالکل تیار ہیں۔ اور ایسی صورت میں رائے سنگھ کا نہ صرف تمہیں لے جانا غیر ممکن ہے۔ بلکہ وہ خود اپنی جان بھی سلامت نہیں لے جا سکتا"

اب اُدے چند رمبھا کو چتا کی طرف جلد جلد لئے جا رہا تھا۔ رمبھا بھی نہایت اطمینان کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ اور اس کے کسی انداز سے خوف وہراس یا مایوسی کا اظہار نہ تھا۔ چتا کے قریب پہنچ کر پجاریوں نے رمبھا کو جئے مل کی لاش کے قریب بٹھا دیا۔ جہاں سے وہ اب بھی پر اطمینان نظروں سے راستہ پر آتے ہوتے سوار کو دیکھ رہی تھی۔ جسکے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اودے چند نے تحکمانہ لہجہ میں پجاریوں سے کہا۔

" چتا میں آگ دو "

× × × × ×

پجاریوں نے فوراً تعمیل کی اور جلتی ہوئی مشعلوں کو لکڑی کے انبار میں ٹھونس دیا۔ پہلے تھوڑا سا دھواں اٹھا۔ اور بعد میں شعلے بھڑکنے لگے۔ اب گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز چتا کے بالکل قریب آچکی تھی۔ یکایک رائے سنگھ مجمع کے روبرو آگیا۔ فوج کے سپاہیوں نے راستہ روک کر بلم اور برچھوں کو رائے سنگھ کے اس قدر قریب کر دیا کہ مجبوراً اسے گھوڑا روکنا پڑا۔ اور سپاہیوں کی اس حرکت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اودے چند کو مخاطب کر کے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

" میں شہنشاہ اکبر کی جانب سے تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ستی کے عمل کو فوراً روک دو "

" تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ شہنشاہ اکبر کا حکم ہے " اُودے چند

نے آگے بڑھتے ہوئے غصہ میں کہا۔

"ثبوت" رائے سنگھ نے اپنے گھوڑے کو ایک طرف موڑتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"ثبوت کے لئے شہنشاہ بہ نفس نفیس خود تشریف لائے ہیں۔"

ابھی یہ جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ واقعی شہنشاہ اکبر اور اس کے محافظین گھوڑوں پر سوار مجمع کے سامنے موجود تھے۔ شہنشاہ نے بآواز بلند کہا۔

"رائے سنگھ رمبھا کو چتا سے نکال لاؤ۔"

لیکن رائے سنگھ اس حکم سے پہلے ہی چتا پر پہنچ چکا تھا۔ بڑھتے ہوئے شعلوں اور بھڑکتی ہوئی آگ کا مقابلہ کرتا ہوا مردانہ وار وہ آگے بڑھا اور چشم زدن میں رمبھا کو گود میں اٹھا کر چتا سے باہر آگیا۔

شہنشاہ اکبر نے نہایت سنجیدہ اور فیصلہ کن انداز میں سارے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آج کی تاریخ سے میری مملکت میں ستی کی رسم ایک سنگین جرم متصور ہو گا۔"

"جہاں پناہ" اودے چند نے مؤدب ہو کر کہا۔ "یہ رسم ہندو مذہب میں ایک نامعلوم مدت سے چلی آ رہی ہے۔"

"لیکن اب ایسا نہ ہوگا۔ اور یہ میرا شاہی حکم ہے۔ اگر آئندہ کسی ہندو بیوہ کو کسی نے ستی ہونے کے لئے مجبور کیا۔ تو وہ شخص شاہی مجرم قرار پائے گا۔ اور اسے خود آگ میں جلنے کی سزا دیجائیگی۔"

اس آخری اور قطعی فیصلہ پر سارے مجمع نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور کسی کو لب ہلانے کی جرات نہ ہو سکی۔

تھوڑے وقفہ کے بعد شاہی محل کو جانے والے راستہ پر شہنشاہ اکبر اور اس کے محافظین نہایت مسرور اور خوش خوش جا رہے تھے۔ شہنشاہ کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ انسانیت اور تہذیب کا ایک اہم فریضہ انجام دینے میں کامیاب ہو کر واپس ہو رہا ہے۔ رائے سنگھ بھی اس مختصر جماعت کے پیچھے پیچھے اپنی عزیز ترین رمبھا کو گود میں بٹھائے گھوڑے پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اور غالباً سب سے زیادہ خوش اور مسرور تھا۔

نوٹ۔ حالانکہ شہنشاہ اکبر نے ستی کے رواج کو اپنے زمانہ میں روکنے کی کوشش کی لیکن صرف اس حد تک کامیابی ہو سکی کہ جبریہ ستی کی رسم بند ہو گئی۔ اس وحشیانہ رسم کا قطعی استیصال لارڈ ولیم بنٹنگ کے زمانہ ۱۸۲۹ء میں ہوا۔

فریب انتقام

فیروز کی ڈاکٹری دنیائے شہرت میں آفتاب کی طرح چمکی اور دیکھتے دیکھتے دھوپ کی مانند شہر کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ بچہ بچہ اس کی قابلیت کا معتقد اور بڑے سے بڑا اہل فن اس کی معلومات کا معترف ہو گیا۔ دیکھنے والے شاہد ہیں۔ کوئی مریض اس کے مطب سے مایوس یا دل برداشتہ ہو کر واپس نہیں ہوا۔ اور کیوں ہوتا۔ جس ہمدردی اور رحمدلی کا نمونہ انہیں یہاں نظر آتا تھا۔ وہ کسی دوسری جگہ سننے میں نہیں آیا۔ مستقل مزاجی اور مہارت کا یہ عالم کہ بڑے سے بڑا اور نازک سے نازک اپریشن جسمیں دوسرے ماہرین فن ہاتھ لگاتے ہوتے گھبراتے تھے۔ ڈاکٹر فیروز کے واسطے بچوں کا کھیل تھا۔ اور عمل جراحی کے موقع پر وہ اپنے نشتر سے اس طرح کام لیتا تھا جس طرح ایک نقاش تصویر بنانے میں برش سے کام لیتا ہے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ کامیابی اس کی لونڈی اور روپیہ اس کا غلام نہ بن جاتا۔ اور ڈاکٹری پر ہی

کیا منحصر تھا اس کے بہترین جاننے والے تو یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں۔ کہ خداوند عالم نے فیروز کے ساتھ ہر فیاضی سے کام لیا تھا۔ اور دنیا کا کوئی فن اور کوئی ترقی ایسی نہ تھی جو ڈاکٹر فیروز کے واسطے غیر ممکن یا دشوار ہوتی۔ وہ فوج کا ایک زبردست سپہ سالار بھی بن سکتا تھا۔ وہ ایک قابل انجینیر بھی ہو سکتا تھا۔ اور اپنی قوتِ تقریر اور قانونی معلومات کی بدولت کمرہ عدالت میں بڑے بڑے وکیلوں کو نیچا بھی دکھا سکتا تھا۔ غرضیکہ ڈاکٹر فیروز کی ہستی ایک ایسی ہستی تھی جس پر کامیابی کو فخر اور شہرت کو ناز تھا۔

قدرت نے دماغی اور اخلاقی خوبیوں کے ساتھ ساتھ حسن ظاہری میں بھی ڈاکٹر فیروز کے ساتھ انتہائی فیاضی سے کام لیا تھا۔ وہ نہایت وجیہ جامہ زیب اور شکیل آدمی تھا۔ نفاست اور شوقینی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی وہ روپیہ جو کنکر پتھر کی طرح اس کے پاس آتا تھا نہایت ناقدری اور کمال بے دردی کے ساتھ پانی کی طرح بہا دیا جاتا تھا۔ عہد موجودہ میں فیشن کی کوئی ایسی شے نہ تھی جو اس کے پاس وافر تعداد میں موجود نہ ہوتی۔ آرائش وزیبائش کا کوئی ایسا سامان نہ تھا۔ جو اس کے بنگلہ میں نہ پایا جاتا۔

مگر ان تمام محاسن اور اوصاف کے باوجود بھی ہمارے ڈاکٹر صاحب بشریت کی فطری کمزوری سے محفوظ نہ تھے۔ اور ایسا ہونا کچھ تعجب بھی نہ تھا۔ ؎

وہ کون ہے جو خرابات میں خراب نہ تھا ❊ ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا

ڈاکٹر صاحب جوان تھے۔ حسین تھے۔ جامہ زیب تھے۔ امیر تھے۔ شوقین تھے۔ پھر اگر عاشق مزاج تھے تو کیا تعجب تھا۔ ہاں سوائے اس کے کہ ڈاکٹر صاحب اس معاملہ میں محتاط نہ تھے۔ اس میں بھی اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو وہ معذور تھے۔ اعلیٰ سوسائٹی کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ فیشن ایبل اور آزاد خیال والدین کی گود میں پرورش پائی۔ اور ہوش سنبھالتے ہی انگلینڈ ایسی مہذب سرزمین پر جو تمدن حاضرہ کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ بغرض تعلیم روانہ کر دیئے گئے۔ پھر طبیعت میں اعتدال پسندی اور احتیاط آتی تو کہاں سے۔ یہی وجہ تھی کہ بیرسٹر مکرجی کی بیوی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے تعلقات ان کی ڈاکٹری سے کچھ کم مشہور نہ تھے۔

روزانہ کا معمول تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے رات کا کھانا کھایا۔ اعلیٰ درجے کا سوٹ زیب تن کیا، اور موٹر لے کر بیرسٹر صاحب کے بنگلہ پر جا دھمکے۔ کچھ دیر شراب و کباب کا شغل رہا اور مسز مکرجی کو لے کر بائیسکوپ پہنچ گئے۔ آندھی آئے۔ پانی برسے۔ پتھر گریں مگر اس معمول میں فرق آنا دشوار تھا۔

(۲)

حسب معمول ایک رات کو ڈاکٹر صاحب کھانے سے فارغ ہو کر بیرسٹر صاحب کے یہاں جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ کہ ملازم نے چاندی کی تشتری میں ایک ملاقاتی کارڈ پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت خیالِ جاناں میں از سرتاپا مستغرق تھے بھلا اس خلل اندازی کی تاب کیسے لا سکتے تھے۔

جبینِ نازک شکن آلود ہو گئی۔ ابرووٗں میں خم آگیا۔ بہت سخت لہجہ میں فرمایا۔
"کیوں جی۔ میں کئی بار تم سے کہہ چکا ہوں۔ کہ اس وقت میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔"

ملازم بیچارہ ڈاکٹر صاحب کی تیوری دیکھ کر سہم گیا تھا۔ اس لب ولہجہ نے سہے سہے ہوش بھی اڑا دیئے۔ خوفزدہ ہو کر تھرائی ہوئی آواز سے بولا۔
"حضور میں نے لاکھ لاکھ کہا۔ مگر کوئی مانے بھی۔ وہ تو کوئی بہت بگڑے دل معلوم ہوتے ہیں۔ اگر زیادہ پس وپیش کرتا تو کوئی عجب نہیں ڈنڈے سے خبر لیتے۔"

ڈاکٹر صاحب نے بہت حیرت سے یہ جواب سُنا اور چیں بجبیں ہو کر خشم آلود نگاہیں کارڈ پر ڈالیں۔ لکھا تھا۔

"کرم خاں غزنوی"

چند منٹ تک بغور کارڈ کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ملازم سے فرمایا کہ خانصاحب کو اندر بھیج دو۔

خانصاحب نہایت گورے چٹے اور بڑے تن وتوش کے آدمی تھے۔ ان کے چہرے سے بہادری اور جرأت کا اظہار ہوتا تھا۔ آنکھوں سے سخت مزاجی اور غصہ عیاں تھا۔ علاوہ ہندوستان کے خان صاحب کو دوسرے ممالک میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس لئے انگریزی صحیح اور بے تکلف بول سکتے تھے۔ داخل ہوتے ہی خان صاحب بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے مہذبانہ انداز میں پوچھا۔

"آپ مجھ سے یہیں مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ یا باہر لے جایئے گا"۔
خانصاحب نے جواب دیا۔
"آپ کو میرے مکان تک چلنا پڑے گا۔ میرا موٹر باہر منتظر ہے"۔
"مگر اس وقت تو میرا چلنا غیر ممکن ہے"۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "کیوں کہ اس وقت ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں آپ کے مریض کو صبح دیکھ لوں"۔
خان صاحب نے یہ کہتے ہوئے "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود"۔ کوٹ کی اندرونی جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور نہایت لاپروائی سے ڈاکٹر صاحب کے سامنے پھینک کر فرمایا۔
"یہ سو روپیہ حاضر ہے۔ اس وقت اگر آپ نہ چلے تو صبح کو آپ کیا کسی ڈاکٹر کا بھی جانا بالکل بے سود ہوگا"۔
اب ڈاکٹر صاحب عجیب کشمکش میں تھے۔ ایک طرف اپنی محبوبہ سے وعدہ خلافی کا خوف۔ دوسری طرف سو روپیہ کے جانے کا ملال۔ نہ انکار کرتے بنتا ہے نہ اقرار۔ ہنوز ڈاکٹر صاحب نے کوئی قطعی فیصلہ نہ کیا تھا۔ اور اسی شش و پنج میں تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ کہ خاں صاحب گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔
"ڈاکٹر صاحب جلد فیصلہ فرمایئے۔ مریض کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑ رہی ہو گی۔ اگر آپ نہیں چل سکتے تو اجازت دیجئے۔ تاکہ میں دوسرے ڈاکٹر کا انتظام کر دوں"۔

ڈاکٹر صاحب یہ نادر شاہی حکم سن کر چونکے۔ گھڑی پر نظر ڈالی ۸½ بجے تھے دل میں کہا۔ کہ اگر ۹ بجے تک فرصت مل جائے تو یہ اچھی خاصی رقم بالکل مفت ہاتھ آتی ہے۔ اس سرسری فیصلے کے بعد دریافت کیا۔

"مریض بیمار کیا ہے اور مجھے کتنا وقت صرف کرنا ہوگا"؟

خانصاحب یہ سُن کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور بولے۔

"زیادہ سے زیادہ آپ کے پانچ منٹ ضائع ہوں گے۔ بیماری کے متعلق آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ میں اسلحہ کی تجارت کرتا ہوں۔ بعض اسلحہ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو زہر میں بجھائے جاتے ہیں۔ اور ان کا زخم کبھی اچھا نہیں ہوتا اگر زخم کی سمیت کو بذریعہ اپریشن فوراً دور نہ کیا گیا تو رفتہ رفتہ زہر تمام جسم میں پہنچ جاتا ہے اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مریض ختم ہو جاتا ہے۔ آج بعد مغرب ایک خریدار کو کچھ اسلحہ دکھائے گئے۔ جن میں ایک زہر آلود خنجر بھی تھا۔ خریدار کی روانگی پر میری بیوی ان چیزوں کو میز سے اٹھا کر الماری میں بند کر رہی تھی۔ کہ اتفاقیہ ایک کرسی کی ٹھوکر لگی اور وہ فرش پہ گر پڑی۔ بدقسمتی سے زہر آلود خنجر ہاتھ میں تھا۔ جس کی نوک اس کے زیریں لب میں پیوست ہو گئی۔ اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ مریض کی حالت معمولی سی غفلت کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بسم اللہ تشریف لے چلئے دیر نہ کیجئے"۔

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوتے کہا۔

"خانصاحب تشویش کی ضرورت نہیں۔ عموماً ایسے زہر کے مہلک اثرات چوبیس گھنٹے کے بعد رونما ہوتے ہیں۔ اگر صبح تک اپریشن ملتوی کر دیا جائے۔

تو کوئی نقصان نہیں۔"

اب خانصاحب کے واسطے ضبط و تحمل ناقابل برداشت اور ڈاکٹر صاحب کی معلومات ایذا رساں تھی۔ فوراً غصہ آ گیا اور کڑک کر بولے۔

"رہنے بس رہنے دیجئے۔ معلوم ہو گیا کہ آپ جانا نہیں چاہتے۔ جناب والا ذاتی تجربہ کے مقابلہ میں قیاس کوئی چیز نہیں۔ میں نے بچشم خود ایسے مریضوں کو چند گھنٹوں میں چٹ پٹ ہوجاتے دیکھا ہے۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ ایسے زہر چوبیس گھنٹے میں اپنا اثر دکھاتے ہیں کیا خوب۔ نہیں معلوم آپ کے یہاں ایسا تو کو چوبیس گھنٹے تک کون پکڑے بیٹھا رہتا ہے۔ اور پھیلنے نہیں دیتا۔"

اس اکھڑ اور مضحکہ خیز گفتگو سے ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے کہ ایسے انسان نما جانور کو کوئی قابلیت معقول نہیں کر سکتی۔ یہ شخص مجھے یاد رہے گا بغیر لئے ہوئے یہاں سے نہ ٹلے گا۔ ابھی کافی وقت ہے صرف پونے نو بجے ہیں۔

یہ سوچ کر بغیر کچھ کہے ہوئے ڈاکٹر صاحب کرسی سے اٹھے۔ اور اوزاروں کا ہینڈ بیگ لیا۔ اور اوور کوٹ پہن کر چلنے کے واسطے تیار ہو گئے۔ باہر آکر نوکر سے بولے۔

"دیکھو اگر مسٹر مکرجی ٹیلیفون کریں تو کہہ دینا کہ ایک مریض کو دیکھنے گئے ہیں۔ وہیں سے برلو اسٹرٹ وِنگ آپ کے یہاں پہنچ جائیں گے۔ آپ منتظر رہیں۔"

ان لوگوں کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے نہایت تیزی سے موٹر کو چلانا شروع کیا اور چند منٹ میں ایک پختہ دو منزلہ مکان کے روبرو پہنچ کر روک دیا۔

خان صاحب مضطربانہ موٹر سے اترے اور ڈاکٹر صاحب کو لئے ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی اور کمرہ طے کر کے صحن میں پہنچے جہاں ایک ضعیف عورت

لالٹین لئے ہوئے پہلے سے کھڑی تھی۔ خانصاحب نے گھبراتے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔
"کہو بڑی بی کیا حالت ہے۔ ہوش تو نہیں آیا۔"
"جی نہیں۔ ابھی تک بیہوش ہیں۔" ضعیفہ نے جواب دیا۔
"انتظار کی ضرورت نہ تھی۔" خانصاحب نے لپک کر بڑھیا سے لالٹین لی۔ اور ڈاکٹر صاحب کو روشنی دکھاتے ہوئے زینہ پر چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچ کر خانصاحب نے لالٹین وہیں چھوڑی اور ڈاکٹر صاحب کو لے کر ایک کمرہ میں داخل ہوئے۔

بحالت مجموعی کمرہ ہر قسم کے نمائشی سازوسامان سے خالی تھا۔ اس کی زیب وزینت ایک فرش۔ ایک چھوٹی سی میز۔ ایک کرسی اور گوشہ میں ایک مسہری پر منحصر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے لیمپ کی تیز روشنی میں دیکھا۔ کہ مسہری پر ایک دراز قامت عورت سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی بے حس پڑی ہے۔

خانصاحب نے میز سے لیمپ اٹھایا۔ اور مسہری کے قریب پہنچ کر آہستہ آہستہ مریضہ کے چہرہ سے چادر ہٹادی۔ حالانکہ مریضہ کی ناک سے لیکر اوپر کا حصہ اب بھی ایک سفید رومال میں چھپا ہوا تھا۔ اور صرف منہ کا دہانہ۔ ٹھوڑی اور گردن کا کچھ حصہ کھلا تھا۔ مگر اس مختصر سے حصۂ جسم میں ہمارے دل پھینک ڈاکٹر صاحب نے جس نمونہ قدرت کا مشاہدہ کیا۔ اس کا اندازہ ان کی مبہوت آنکھوں اور کھوئی ہوئی طبیعت سے بخوبی کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کی بھی خبر نہ رہی کہ میں کہاں ہوں۔ اور کیا دیکھ رہا ہوں۔ کس واسطے یہاں لایا گیا ہوں۔ اور مجھے کیا کرنا ہے۔ زخم تو دیکھنا گئے بھول۔ ڈاکٹر صاحب کی حسن پرست آنکھیں مریضہ کے چہرہ پر گڑی ہوئی تھیں۔ دل و دماغ ایک غیر معلوم وجدانی کیفیت سے معمور ہو رہا تھا۔

تمام اعضا ایک پُر کیف اثر سے متاثر ہو رہے تھے۔ ہنوز ڈاکٹر صاحب مریضہ کے دلفریب اور ہوشربا حُسن کے نظارہ سے آسودہ نہ ہوتے تھے۔ دل میں ایک غیر معمولی تلاطم برپا تھا۔ اور نقش بدیوار کھڑے تھے۔ کہ یکایک خانصاحب کی آواز نے چونکا دیا۔

"براہ مہربانی جلدی کیجئے" خانصاحب نے کہا۔ "نو بجنے میں کچھ ہی منٹ باقی ہیں۔ آپ کو بھی جانا ہے۔ اور مجھے بھی بے چینی ہو رہی ہے"

ڈاکٹر صاحب نے بمشکل اپنی دل و دماغ کی ہیجانی کیفیت کو مغلوب کرتے ہوئے جواب دیا۔

"گو اب بھی مجھے یقین ہے۔ کہ زہر کے مہلک اثرات کو ظاہر ہونے میں بہت عرصہ کی ضرورت ہے۔ تاہم آپ کے اصرار سے مجھے اپریشن کرنے میں عذر نہیں مگر......

اس قدر کہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بنظر یاس مریضہ کی طرف دیکھا۔ اور خاموش ہو گئے۔

خانصاحب نہایت جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی تھے ڈاکٹر صاحب کی معنی خیز خاموشی کو فوراً سمجھ گئے اور مسکراتے ہوئے بولے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ جو خیال اب آپکو اپریشن کے ارادہ سے روک رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری بیوی کا حُسن و جمال عملِ جرّاحی سے خاک میں مل جائے گا۔ مگر ڈاکٹر صاحب مجھے اپنی محبوبہ کی زندگی اس کے دلفریب حُسن سے زیادہ عزیز ہے میں اپنی اس عزیز ترین مونس تنہائی اور بہترین شریکِ زندگی کی بدصورتی گوارا کر

سکتا ہوں مگر خدانخواستہ اس کی دائمی مفارقت کا خیال بھی میرے واسطے ناقابل برداشت اور سوہان روح ہے"

ڈاکٹر صاحب جو حُسن کے پجاری اور خوبصورتی کے پرستار تھے۔ خانصاحب کی فلسفیانہ گفتگو سن کر بے حد خفیف ہوتے۔ اور بغیر کوئی جواب دیئے ہوئے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر کلوروفارم کی شیشی اور نشتروں کا بکس باہر نکال لیا۔ خانصاحب نے نشتروں کی طرف تو کوئی توجہ نہ کی۔ مگر شیشی دیکھ کر جھجکے اور فرمانے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب اس قسم کی انگریزی ادویات کا استعمال ہم مسلمانوں کے یہاں اول تو شرعاً ممنوع ہے۔ دوسرے میں نے مریضہ کو افیون اتنی تعداد میں دے دی ہے۔ جس سے وہ عمل جراحی کیواسطے کافی بے ہوش ہے۔ آپ کلوروفام سونگھائے بغیر آسانی سے اپریشن کر سکتے ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ شیشی کو ہینڈ بیگ میں رکھ دیا۔ اور بکس سے ایک نشتر نکال کر اس کی دھار کا بخوبی اطمینان کرنے کے بعد دونوں آستین پڑھا کر لیمپ کو مریضہ کے قریب لانے کا اشارہ کیا۔ خانصاحب نے فوراً تعمیل کی ڈاکٹر صاحب نے نشتر کی گرفت کو داہنے ہاتھ میں مضبوط کر کے بائیں ہاتھ سے مریضہ کا لب زیریں پکڑ لیا۔ مریضہ کے نیم برہنہ چہرہ پر بادیگر حسرت و یاس کی نظر ڈالی اور چشم زدن میں لبِ نازک کا ایک مثلث ٹکڑا جو ابھی چند لمحے قبل ایک صنفِ نازک کے بے نظیر اور قابلِ رشک حسن و جمال کا جزو اعظم بنا ہوا تھا۔ نہایت بے دردی اور کمال حقدت سے علیحدہ کر کے سانپ کے پھن کی طرح فرش پہ پھینک دیا۔ خون کا فوارہ جاری ہوا اور ایک دردناک چیخ کے ساتھ مہ جبیں مریضہ بستر

پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ درد کی اذیت اور بے چینی نے صبر و تحمل ہاتھ سے کھو دیا۔ صبر و قرار جاتا رہا۔ اضطراری کی کیفیت میں سر کا کپڑا نوچ کر پھینک دیا گیا۔ چادر جو اس وقت تک سارے جسم کی پردہ داری کر رہی تھی الگ جا رہی، اور مریضہ کی پُر خوف اور متحیر نگاہیں کمرہ میں چاروں طرف گردش کرنے کے بعد ہمارے منچلے ڈاکٹر کے چہرہ پر جم گئیں۔ حالانکہ مریضہ کا یہ انداز پریشانی ڈاکٹر صاحب کی انتہائی خوش نصیبی کا سبب کہا جا سکتا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی للچائی ہوئی نظریں مریضہ کے یگانہ روزگار۔ تناسب اعضا اور حسن و خوبصورتی کے زندہ مجسمہ کے نظارہ سے کافی لطف اندوز ہو سکتی تھیں مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ مریضہ سے آنکھیں چار ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت ہی بگڑ گئی۔ ہوش و حواس غائب، رنگت زرد سر میں چکر، ہاتھ پاؤں میں رعشہ۔ اِدھر مریضہ پھر ایک کراہ کے ساتھ غش کھا کر بستر پر گری۔ اُدھر ڈاکٹر صاحب بھی با عالِ پریشان دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

افسوس! یہ مریضہ جسے اس وقت تک ڈاکٹر فیروز صاحب کرم خاں غزنوی کی بیوی سمجھ ہوئے تھے۔ درحقیقت ان کی معشوقہ مسز مگوجی تھی۔

ہنوز ڈاکٹر صاحب بے حس و حرکت منہ چھپاتے ہوئے کرسی پر بیٹھے تھے کہ یکایک کمرہ میں قہقہہ کی آواز آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے چونک کر سر اٹھایا۔ دیکھا مسٹر مگوجی ہاتھ میں مصنوعی ڈاڑھی مونچھیں لئے مسکرا رہے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کے واسطے سارا راز آئینہ تھا۔

دوسرے دن تمام لوکل اخباروں میں یہ خبر نہایت حیرت اور تعجب سے

پڑھی گئی کہ مسز مکرجی نے کسی خاص وجہ سے ہمیشہ کے واسطے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اور ڈاکٹر فیروز صاحب کا کسی غیر معمولی صدمہ سے دماغ خراب ہوگیا اور کسی پاگل خانے میں بھیج دیئے گئے ؛

✽ ✽ ✽ ✽ ✽

گوہرِ نایاب

انگلینڈ کے مشہور شہر برمنگھم کا رستارنٹ دوپہر کا کھانا کھانے والے مرد اور عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہنری نارمن بھی آکر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ ابتدائے ملازمت سے وہ روزانہ اسی رستارنٹ میں کھانا کھاتا اور ٹھیک ایک بجے لنچ اور ۵ بجے شام کو چائے کے واسطے رسطارنٹ میں داخل ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا۔ نہ کسی سے مخاطب ہوتا نہ کسی سے بات کرتا اور نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا۔ گردن جھکائے بظاہر کسی غور و فکر میں مبتلا خاموشی سے آتا۔ اور اسی طرح چلا جاتا۔

ہنری نارمن کا سن تقریباً تیس سال، قد میانہ مگر چہرہ پر غیر معمولی زردی پائی جاتی تھی۔ پوشش نہایت صاف ستھری مگر معمولی جس سے اس کی عسرت اور کم مائیگی کا پتہ چلتا تھا۔

حالانکہ آج سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ آسمان بالکل

صاف اور ہوا نہایت خوشگوار تھی۔ ہر شخص مسرور اور شاداں نظر آرہا تھا۔ مگر بیچارے ہنری نارمن کا چہرہ آج اور بھی زیادہ افسردہ اور اداس تھا۔ بینڈ باجے نے جس وقت "ہوم سویٹ ہوم" بجانا شروع کیا تو اس حرماں نصیب کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ ایک سرد آہ بھری اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس غریب کا کوئی گھر نہ تھا۔ نہ کوئی دوست۔ نہ کوئی عزیز تھا نہ رشتہ دار۔ اگر اس عظیم الشان شہر میں کوئی اُس سے بولنے والا تھا تو وہ اس کمرہ کی ضعیف مالکہ تھی جس میں یہ رہتا تھا۔ اور یہ ضعیفہ بھی صرف ہفتہ کی شام کو اپنے کرایہ کی وصولیابی پر دو چار جملے شکریہ کے کہہ دیا کرتی تھی۔ ورنہ ہنری نارمن تھا اور اس کا دردبھرا دل۔ وہ تھا اور اُس کے خیالات پریشان۔

کھانے کی میز سے اُٹھ کر اس نے ٹوپی اٹھائی۔ اور جانے کیلئے دروازہ کا رُخ کیا ہی تھا۔ کہ کسی نے اس کے شانہ پر ملائمیت سے ہاتھ رکھکر آہستہ سے کہا۔

"کیوں کرلی آج کل کیسی گذر رہی ہے"۔

ہنری نارمن نے مڑکر اپنے مخاطب پر نظر ڈالی۔ لیکن نہیں معلوم ان الفاظ اور اس شخص کی شکل میں کونسا جادو تھا۔ جس نے ہنری کے حواس خمسہ بیکار کردیئے۔ رگوں میں خون خشک ہوگیا۔ زبان تالو سے لگ کر رہ گئی اور چہرہ پر مردنی چھاگئی۔

مخاطب نے ہنری کی حالت دیکھکر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کرلی، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ باہر آؤ۔ میں نے ایک چھوٹا مقام تلاش کرلیا ہے"۔

اب ہنری نارمن اس شخص کو بخوبی پہچان گیا تھا۔ کسی زمانہ میں یہ دونوں آپس میں دوست تھے۔ مگر عرصہ ہوا کہ ہنری کو اس کے مرنے کا یقین ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں ہنری نارمن کرلی کے نام سے مشہور تھا۔ مگر اب اس نے اس نام کو خیرباد کہنے کے ساتھ ساتھ اس ناپاک ذریعہ معاش کو بھی قطعاً ترک کر دیا تھا۔ جس نے عرصہ تک اسے جیل کے مصائب برداشت کرنے کے واسطے مجبور کیا۔ اب وہ ایک شریف آدمی کی طرح ایماندارانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اور کرلی کے بجائے ہنری نارمن مشہور تھا۔

رسٹارنٹ سے باہر آکر دوسرے آدمی نے ہنری نارمن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کرلی، تم مجھ سے مل کر بظاہر خوش نہیں معلوم ہوتے"۔

ہنری نارمن نے خوفزدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

پینیٹ مجھے اس نام سے مخاطب نہ کرو۔ کرلی کے منحوس نام کو میں نے پانچ برس ہوئے چھوڑ دیا۔ اب میں ہنری نارمن ہوں۔ اور شریفانہ زندگی بسر کرتا ہوں"۔

"علیٰ ہذا" پینیٹ نے کہا۔ "تم بھی مجھے علانیہ پینیٹ کے نام سے نہ پکارنا۔ کیونکہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ پینیٹ مر گیا۔ اس لئے اسے مردہ ہی رہنے دو۔ اب میں جان ڈیوائٹ ہوں۔ خیر اب میں اصل معاملہ کے متعلق تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں"۔

ہنری نارمن نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے دفتر پہنچنے میں دیر ہو جائے"۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا"۔ پلینٹ نے جواب دیا۔ "ایسا ہونے میں میرا خود نقصان ہے، آمدم برسر مطلب۔ تم ایک لوہے کے کارخانہ میں کلرک ہو۔ میں تین مہینہ سے تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ تم غالباً بتیس روپیہ ہفتہ تنخواہ پاتے ہو۔ سردست

میں کالمور ہوٹل میں مقیم ہوں۔ اور ہر شخص مجھے ایک متمول آدمی خیال کرتا ہے۔"

گفتگو کے بعد بھی جب پیٹ کا اصل مدعا معلوم نہ ہوا۔ تو ہنری نے بے چین ہو کر کہا۔

"جو کچھ مطلب ہو جلد بیان کرو۔ میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ اور ٹھہر سکتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے دفتر پہنچ جانا چاہیئے۔"

پیٹ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"اس قدر کیوں عجلت ہے۔ تمہیں دیر ہو جب ہی کہنا۔ درحقیقت مجھے تمہاری حالت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ تمہارا ایسا آدمی اور ایسی حقیر آمدنی پر بسر کرے۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔"

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" ہنری نے کہا۔ "میں اپنی موجودہ حالت سے بالکل مطمئن ہوں۔"

"نہیں۔" پیٹ نے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔ بحیثیت ایک دوست ہونے کے میں تمہیں اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے ترقی کی ایک صورت میرے ذہن میں آئی ہے۔ جو نہایت آسان ہے۔ تم غالباً بڈھے سائیلس کو جانتے ہو گے جو سچے موتیوں اور ہیرے کی تجارت کرتا ہے۔ کل شام کو کالمور ہوٹل میں اُس نے سر فرینک ٹھینسن سے دو موتیوں کا سودا کیا ہے۔ جو جسامت میں فاختہ کے انڈے کے برابر ہیں۔ اور ایک ایک موتی دس دس ہزار پونڈ قیمت کا ہے۔ بڈھا سائیلس کل ان موتیوں کو بذریعہ رجسٹری سر ٹھینسن کے پاس روانہ کریگا۔"

قطع کلام کرتے ہوئے ہنری نے گھبرا کر کہا۔

"غضب خدا کا۔ کیا اُن موتیوں کو لوٹنا چاہتے ہو"۔

پینیٹ نے کسی قدر ترش رو ہو کر جواب دیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پہلے خاموشی سے پوری گفتگو سن لو۔ پھر رائے زنی کرنا۔ میں ہفتوں سے اس بڈھے سائیلس کی نگرانی کر رہا ہوں۔ اس کا قاعدہ ہے کہ جملہ رجسٹری خطوط خود ڈاک خانہ چھ بجے لے جاتا ہے۔ اور شام کو سات بجے ڈاکیہ آکر سب رجسٹریاں بڑے ڈاک خانہ پہنچاتا ہے"۔

کرلی سے پھر ضبط نہ ہو سکا اور بددل ہو کر بولا۔

"بھائی تم بھی غضب کرتے ہو۔ ڈاکیہ سے تھیلا چھین لینا کسی طرح ممکن نہیں۔ وہ ایک بڑی گاڑی پر آتا ہے اور اس وقت تمام سڑک آدمیوں سے بھری ہوئی ہے یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں جاتا ہوں"۔

پینیٹ نے غضب ناک ہو کر کہا۔

اگر تم چلے گئے تو اچھا نہ ہوگا۔ تمہارے مخبط الحواس ہونے میں کون شک کر سکتا ہے پوری بات نہیں سنتے اور جو جی میں آتا ہے، آئیں، بائیں۔ شائیں اڑانے لگتے ہو۔ میاں صاحبزادے، ہوش میں آؤ۔ تھیلا چھیننا مقصود نہیں۔ بلکہ آنکھوں میں خاک ڈال کر ایمانداری سے قبضہ کرنا مقصود ہے۔ تمہیں محض چند منٹ کے واسطے ڈاکیہ کا بہروپ اختیار کرنا ہوگا۔ جس کام میں۔ میں بخوبی واقف ہوں کہ تم اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ڈاکیہ کی وردی وغیرہ سب میں نے پہلے ہی سے فراہم کر لی ہے۔ ڈاک خانہ جا کر ڈاکیہ کی آواز، اور اس کا انداز گفتگو وغیرہ ذہن نشین کر لینا تمہارے ایسے آدمی کے واسطے دشوار نہیں۔ شام کو عموماً مردوں کے بجائے ڈاک خانوں میں لڑکیاں کام کرتی ہیں۔

اور اس وقت بہت مشغول ہوتی ہیں۔ علاوہ اس کے وہ سڑک بھی نسبتاً تاریک رہتی ہے۔ اس حالت میں تمہیں بتاؤ یہ کونسا دشوار کام ہے۔ بخدا اتنی بڑی رقم بالکل مفت ہاتھ آرہی ہے۔ اصلی ڈاکیہ سے ہم لوگ چند منٹ قبل ڈاک خانہ پہنچ جائیں گے اور چند ساعت میں اپنا کام کرکے نو دو گیارہ ہو جائیں گے۔ بولو۔ اب کیا کہتے ہو۔ لیکن فیصلہ سے پہلے ذرا دس ہزار پونڈ کی رقم کو بھی غور کر لینا۔"

ہنری نارمن گو اب ان سیہ کاریوں سے توبہ کر کے ایماندارانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر پھر بھی انسان تھا۔ فرشتہ نہ تھا۔ دس ہزار کی رقم قلب انسانی کو منقلب کرنے کے واسطے کافی وزنی تھی۔ چند ساعت کی خاموشی کے بعد ہنری نے جو فیصلہ کیا وہ ظاہر تھا۔

× × × × ×

اسی دن شام کو ہنری نارمن اصلی ڈاکیہ کو دیکھنے اور اس کا انداز گفتگو وغیرہ سمجھنے کیواسطے ڈاکخانہ پہنچا۔ چند منٹ انتظار کے بعد ڈاکیہ داخل ہوا۔ اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر باآواز بلند بولا "رجسٹری کا تھیلا" فوراً ایک لڑکی نے مع ایک کاغذ کے ڈاکیہ کی طرف بڑھا دیا۔ ڈاکیہ نے کاغذ پر دستخط کئے اور تھیلا کاندھے پر ڈال کر روانہ ہو گیا۔ سارا کام ایک منٹ کے اندر ہی ختم ہو گیا۔ جسے ہنری نارمن بغور دیکھ رہا تھا۔ ڈاکیہ کی روانگی پر ہنری نارمن نے محض حیلہ کے واسطے ایک ٹکٹ خریدا۔ اور باہر آکر پینٹ سے مسرور لہجہ میں بولا۔

"واقعی بے حد آسان ہے"

"میں جانتا تھا کہ تم یہی کہو گے" پینٹ نے جواب دیا۔

"اب میرے ہمراہ میرے دفتر آؤ۔ جسے میں نے یہاں قریب ہی کرایہ پر لے

رکھا ہے۔ اور اپنے کو کمیشن ایجنٹ مشہور کر رکھا ہے۔ وہاں اطمینان سے ڈاکیہ کا پارٹ کر کے خوب مشق کر لو۔"

ہنری نارمن کو ہمراہ لئے ہوئے پینیٹ اپنے دفتر آیا۔ اور تقریباً آدھ گھنٹہ کی مشق نے ہنری نارمن کو اچھا خاصہ ڈاکیہ بنا دیا۔ ہر طرح مطمئن ہو کر پینیٹ نے کہا۔

"بس اب کل تمہارا تھیلا لے آنا یقینی ہے۔ ہم دونوں آدمی فوراً یہاں چلے آئیں گے۔ تم اطمینان سے کپڑے پہن کر مکان چلے جانا۔ اور میں جملہ مخدوش چیزیں جلا ڈالوں گا۔ پھر دو ایک روز میں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔"

دوسرے دن شام کو سات بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔ کہ ہنری نارمن ڈاکیہ کے لباس میں ڈاکخانہ میں داخل ہوا۔ آواز بنا کر پکارا۔ "رجسٹری کا تھیلا" لڑکی نے سرسری نظر سے دیکھا اور حسبِ معمول کاغذ اور تھیلا اس کی طرف بڑھا دیا۔ ہنری نے کاغذ پر دستخط کئے اور تھیلا کندھے پر ڈال کر چل دیا۔ ڈاک خانہ سے نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ ڈاک لیجانیوالی گاڑی اس وقت آ کر ٹھہری۔ مگر اس کے حواس میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ اور فوراً پینیٹ سے جا کر مل گیا۔ دو منٹ میں یہ لوگ پینیٹ کے دفتر میں موجود تھے۔ پینیٹ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شاباش کر لی شاباش۔ کیا کہنا ہے۔ بس اب تم کپڑے پہن کر جاؤ۔ اور میں سوائے موتیوں کے سب چیزوں کو ٹھکانے لگائے دیتا ہوں۔ اب دو ایک دن ہمیں خاموشی سے اس تماشہ کو دیکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد اپنا اپنا حصہ لیکر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔"

دوسرے دن تمام مقامی اخباروں میں عجیب عجیب سرخیوں سے یہ خبر شائع

کی گئی جسکا خلاصہ یہ تھا کہ اسمال برک پوسٹ آفس میں کسی چور نے انتہائی چالاکی سے رجسٹری کا تھیلا غائب کر دیا۔ تقریباً سو مختلف قسم کی رجسٹریاں تھیں جن میں نوٹ، چک اور دیگر قسم کی قیمتی اشیاء تھیں۔ منجملہ ان کے ایک پارسل میں دو سچے موتی بھی تھے۔ جن کی تخمینی قیمت فی موتی دس ہزار پونڈ تھی۔

جنرل پوسٹ نے مقامی پولیس کو اطلاع کرنے کے ساتھ ساتھ انگلینڈ کے مشہور خفیہ کار پرداز نک کارٹر کو بھی بذریعہ تار بلا لیا تھا۔ جو معہ اپنے اسسٹنٹ دسن کے کوئینس ہوٹل میں مقیم تھا۔ مقامی پولیس انتہائی کوشش کے باوجود اس وقت تک کسی قسم کا سُراغ لگانے سے قطعی ناکام تھی۔

ایک دن صبح کو ناشتہ سے فارغ ہو کر نک کارٹر سیدھا پولیس دفتر پہنچا۔ انسپکٹر سے دیر تک گفتگو رہی۔ مگر کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جو نک کارٹر کی کاروائیوں میں مفید ہو سکتی۔ ایسی صورتوں میں اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ وہ اپنی دماغی قوت اور ذاتی قابلیت سے خود کوئی راستہ پیدا کرے۔ سب سے پہلے اس نے سائیمس جوہری سے ملنا ضروری خیال کیا۔ وہیں بذریعہ ٹیلیفون اسے مطلع کیا گیا۔ اور چند منٹ میں بڈھا جوہری پولیس دفتر میں آموجود ہوا۔ کارٹر نے جوہری سے سوال کیا۔

"کیا ایسا واقعہ کبھی اس سے پیشتر بھی آپ کو پیش آیا ہے"۔

ایک ٹھنڈی سانس لے کر جوہری نے جواب دیا۔

"مجھے یہ کام کرتے ہوئے تیس سال ہو چکے ہیں۔ اور ان ہاتھوں سے لاکھوں روپیہ کا مال بذریعہ ڈاک روانہ کیا ہو گا مگر کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہی

سب سے پہلا نقصان ہے جو میرے واسطے کسی حد تک ناقابلِ برداشت ہے"۔

"کیا آپ کو یقین ہے" کارٹر نے پوچھا۔ کہ آپکے جملہ ملازمین قابلِ اعتبار اور متدین ہیں؟"

"بیشک" جوہری نے جواب دیا" اس کے علاوہ ان موتیوں کے سودے کی اطلاع سوائے میرے کسی کو نہ تھی۔ جملہ خط و کتابت بصیغہ راز ہوئی۔ کالمور ہوٹل میں سر فرینک ہنٹسن سے جاکر میں نے خود گفتگو کی، اور معاملہ طے ہو جانے پر میں نے اپنے ہاتھوں سے موتیوں کو بند کیا۔ اور خود ڈاک خانہ لے گیا۔"

"اس احتیاط کے باوجود بھی" کارٹر نے کہا تعجب ہے۔ کہ چوروں کو اطلاع ہو گئی اور کیسی اطلاع۔ یہ تک معلوم ہو گیا کہ آپ کس ڈاک سے موتیوں کو روانہ کر رہے ہیں"۔

چند ساعت غور کرنے کے بعد کارٹر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "اس میں شک نہیں کہ چوروں کا مقصد محض موتیوں پر قبضہ کرنا تھا۔ کیونکہ رجسٹری کے تھیلے میں دوسری چیزیں ان کے کسی مصرف کی نہ تھیں۔ اچھا اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں"۔

جوہری کی روانگی پر نِک کارٹر بھی انسپکٹر سے رخصت ہو کر ڈاک خانہ پہنچا اسی لڑکی کا بیان لیا۔ جو چوری والی شام کو ڈیوٹی پر تھی۔ دوسری لڑکیوں نے بھی جو اس وقت کام پر تھیں۔ بیان کیا۔ کہ چور میں اور اصلی ڈاکیہ میں قطعی فرق نہ تھا۔ دستخط والے کاغذ بھی دیکھے گئے۔ اصلی اور نقلی ڈاکیہ کے دستخطوں میں ضرور فرق تھا۔ مگر یہ فرق ایسا نہ تھا کہ بادی النظر میں محسوس ہو سکتا۔ اصلی ڈاکیہ جس کا

نام جان وِلل تھا طلب کیا گیا۔ جس سے مختلف سوالات کرنے کے بعد نِک کارٹر نے اس کے جسم کی ساخت کا بغور معائنہ کیا۔ اور ڈاک خانہ سے نکل کر کوئینس ہوٹل اپنی جائے قیام پر آگیا۔ نک کارٹر کا اسسٹنٹ وِلسن پولیس ڈائری کا معائنہ کر رہا تھا۔ نک کارٹر کو دیکھتے ہی بولا۔

" ڈائری میں ایسے جرائم کرنے والے بہت سے بدمعاشوں کا پتہ تو چلتا ہے۔ مگر کسی کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا دشوار ہے۔ اکثر ایسے ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ مر گئے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو عرصہ سے پولیس کی گرفت میں نہیں آئے۔ اس لئے ان کی نقل و حرکت بھی نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے۔ کوئی بالکل نیا آدمی ہے"۔

"نہیں" کارٹر نے کہا "تمہارا خیال غلط ہے۔ کسی نئے آدمی کی یہ حرکت نہیں ہو سکتی۔ واقعہ کی نوعیت اس بات کی دلیل ہے۔ کہ یہ فعل کسی ایسے شخص کا ہے جو ایسے کاموں میں بخوبی تجربہ کار اور مشاق ہے"۔

تقریباً آدھ گھنٹہ تک کمرہ میں کامل خاموشی رہی۔ وِلسن ڈائری کے معائنہ میں منہمک رہا۔ اور کارٹر آنکھیں بند کئے کسی گہرے خیال میں مستغرق تھا۔ یکایک وِلسن سے مخاطب ہو کر بولا۔

" وِلسن۔ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ چوری کے بعد تھیلا ڈاک خانہ سے زیادہ دور نہیں لے جایا گیا۔ اس سڑک کے علاوہ دوسری سڑکیں نہایت آباد اور روشن ہیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ چور پر کسی کی نظر نہ پڑتی۔ خیر۔ جوہری کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ کہ اسی نے ادھر فرینک سے کاسمو ہوٹل میں موتیوں کے سودے کے متعلق گفتگو

ہوئی تھی۔ میں بعد دوپہر وہاں جاؤں گا۔ اس دوران میں تم میرے بڑے ٹرنک میں ضروری سامان رکھ کر تیار کر دو۔ اور اس کے بعد پتہ لگاؤ کہ حال میں کسی کباڑی کے یہاں سے کوئی ڈاکیہ کی وردی تو نہیں لایا۔ اس کا بھی خیال رہے کہ میں ہوٹل میں شکل تبدیل کر کے ایک تجارتی آدمی بن کر جاؤں گا۔"

ولسن تھوڑی دیر میں ٹرنک اور سفر کا ضروری سامان تیار کر کے کباڑیوں کی دوکانوں کا چکر لگانے کے لئے چل دیا۔ اور بعد دوپہر تک کارٹر صاحب ایک تجارت پیشہ آدمی کا بہروپ بھر کے بذریعہ ٹیکسی کالمبو ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی وہاں کے مینجر اور نوکروں سے مراسم اور بے تکلفی پیدا کر لینا تو ہمیشہ نک کارٹر کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چنانچہ بہت جلد اس کام سے فارغ ہو کر شام تک کارٹر نے ہوٹل کے مختلف مہمانوں سے بات چیت کرنے اور اخبار بینی میں صرف کیا۔ شام کے کھانے کی گھنٹی ہوتے ہی ڈنر ہال میں سب سے پہلے داخل ہونے والا نک کارٹر تھا۔ اور پہنچتے ہی اپنے واسطے ایک ایسی جگہ تلاش کی جہاں سے وہ ہر آنے والے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ سب لوگوں کے آجانے پر کھانا شروع ہو گیا۔ لیکن نک کارٹر کے واسطے کھانے کے علاوہ کچھ اور کام بھی تھا۔ جس کی تکمیل کے لئے یہ بہترین موقع تھا۔ ہوٹل کے ہیڈ آبدار کو اس نے برابر اپنے ہی پاس رکھا۔ اور مختلف قسم کی گفتگو کرتا رہا۔ کبھی کبھی لیکن نہایت لاپروائی سے کارٹر کسی مہمان کی بابت بھی دریافت کر لیتا تھا۔ ایک مہمان کے استفسارِ حال پر ہیڈ آبدار نے جواب دیا۔

"ان کا نام مسٹر جارڈن ہے۔ یہ انجینیر ہیں۔ اور قریب قریب ہمیشہ یہیں رہتے ہیں۔"

دوسرے آدمی کی نسبت کہا۔

"یہ اسپین کے سیاح ہیں۔ جب ادھر آتے ہیں۔ تو برابر اسی ہوٹل میں قیام کرتے ہیں۔"

تیسرے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان کا نام جان ڈیلوائن ہے۔ ان کے متعلق مجھے زیادہ واقفیت نہیں۔ کیونکہ یہ بالکل پہلی بار یہاں آئے ہیں۔ کئی مہینے سے مقیم ہیں۔ اور غالباً کمیشن کا کام کرتے ہیں۔ سوہو اسٹریٹ پر ان کا ایک دفتر بھی ہے۔"

اب تک کارٹر کے واسطے دیگر مہمانوں کے متعلق دریافت کی ضرورت نہ تھی۔ ہر سہ مشکوک اشخاص کے بارہ میں کافی معلومات فراہم کر چکا تھا۔ جن میں سے خصوصاً آخرالذکر پر شک تو تھا ہی۔ مگر ہیڈ آبدار کے بیان نے اور غیر مطمئن بنا دیا۔ فوراً کھانے کی میز سے اٹھا ہیٹ پہنی اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ بذریعہ ٹیکسی کو تھبنس ہوٹل پہنچا جہاں ویسن اس کا منتظر تھا۔ دیکھتے ہی مسرور لہجہ میں کہا۔

"لیجئے پتہ چل گیا۔ تیسری دوکان والے کباڑی نے بیان کیا۔ کہ ایک جسیم آدمی نے جس کی ڈاڑھی اور مونچھیں سفید تھیں۔ اور دھوپ کی سیاہ عینک لگائے تھا۔ ایک فوجی۔ ایک بحری فوجی اور ایک ڈاکیہ کی وردی خرید کی ہے۔ جملہ چیزیں اس نے ریلوے اسٹیشن پر منگائی تھیں۔ اور بیان کیا تھا کہ تھیٹر کے واسطے مطلوب ہیں۔"

"اچھا میں سمجھ گیا" کارٹر نے کہا۔ "ڈاڑھی اور مونچھوں کو سفید کر لیا گیا تھا بیشک اب ہم لوگ کسی قدر صحیح راستہ پر آ رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے نک کارٹر نے پولیس ڈائری کی جلد جلد ورق گردانی کی۔ اور ایک صفحہ کو بغور پڑھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد بولا۔

"ولسن، چور کا پتہ لگ گیا۔ اصلی نام فلپ نٹ ہے۔ مگر پولیس میں عام طور پر پلینیٹ کے نام سے مشہور ہے۔ ڈائری سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ شخص مانٹی کارلو میں مار ڈالا گیا۔ مگر یہ خبر غلط ہے۔ وہ ہنوز زندہ ہے اور اس وقت کالمور ہوٹل میں جان ڈیوائن کے نام سے مقیم ہے۔ لیکن اس نے تنہا اس کام کو ہرگز نہیں کیا۔ ڈائری بتاتی ہے۔ کہ جرائم کے ارتکاب میں اس کا اور کرلی بینی کا ہمیشہ ساتھ رہتا تھا ایک بار دونوں کو ایک ہی جرم میں سزا بھی ہو چکی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کرلی کہاں غائب ہو گیا۔ خیر پلینیٹ تو موجود ہے۔ ولسن تم فوراً کالمور ہوٹل جاؤ اور اس شخص کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہو۔ اگر ضرورت سمجھنا تو ایک کمرہ بھی لے لینا۔ تھوڑی دیر میں میں بھی اپنا بیگ لئے آتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے بالکل اجنبی رہیں گے۔"

ولسن کی روانگی کے تقریباً آدھ گھنٹہ بعد کارٹر پا پیادہ آہستہ آہستہ کالمور ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ اپنے کمرہ میں پہنچ کر بڑا ٹرنک کھولا اور ایک چھوٹا ہینڈ بیگ لے کر پھر باہر آگیا۔ پیدل چلتے ہوئے اس نے سوہو اسٹریٹ کا رُخ کیا۔ اب کافی رات ہو چکی تھی۔ اور تاریکی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ بہ نسبت دوسری سڑکوں کے سوہو اسٹریٹ زیادہ تاریک تھی۔ اس سڑک پر عموماً لوہے کے کارخانے اور

تاجروں کے دفاتر پائے جاتے تھے۔ کارٹر جس وقت اس سڑک پر پہنچا تو بالکل سناٹا تھا۔ مگر کچھ دور چلنے کے بعد اُس نے ایک پولیس کانسٹیبل کو دیکھا جو ایک دروازہ سے ملا کھڑا تھا۔ کارٹر بظاہر اس کی موجودگی کو نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دور بعد وہ ایک گلی میں مڑا۔ جو بالکل تاریک اور سنسان تھی۔ اب اس نے برقی لیمپ نکالا۔ اور ہر دروازہ کی تختی کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ چند تختیوں کا معائنہ کرنے کے بعد وُہ ایک دروازہ پر ٹھہر گیا۔ جس کی تختی پر "جان ڈیوائن" لکھا تھا۔ کارٹر نے اس کے تالے کو بغور دیکھا۔ آپ ہی آپ کہنے لگا۔

"تالا بالکل جدید اور اچھے قسم کا ہے۔ آسانی سے نہیں کھل سکتا۔"

ابھی یہ الفاظ اچھی طرح ختم نہ ہوئے تھے کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اور چشم زدن میں کانسٹیبل کارٹر کے سر پر موجود تھا۔ کارٹر نے لیمپ بجھا کر جیب میں رکھ لیا۔ اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ کانسٹیبل نے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کوئی چور معلوم ہوتے ہو۔ یہاں کیا کر رہے تھے۔ خاموشی سے میرے ساتھ تھانہ چلو۔"

نک کارٹر کا منشا تھا کہ ساری کارروائی خفیہ ہو جائے۔ اور کسی کو خبر نہ ہو۔ مگر اب اس کا موقع نہ تھا۔ سپاہی صاحب آفتِ ناگہانی کی طرح سر پر موجود تھے۔ مجبوراً اس نے پھر لیمپ نکالا اور سینے سے کوٹ ہٹاتے ہوئے بلا سامنے کو دیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی کانسٹیبل صاحب کا سارا غصہ ہرن ہو گیا۔ گڑگڑا

کر بولے۔

"معاف فرمائیے۔ لاعلمی کی وجہ سے مخل ہُوا۔ اب میں جاتا ہوں۔ جو کچھ کرنا ہے شوق سے کیجئے۔"

کارٹر نے کانسٹیبل کو روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں اب تمہارے جانے کی ضرورت نہیں۔ جب آگئے ہو تو کچھ کام بھی لوں گا۔ مجھے یہ تالا کھولنا ہے۔ تم سامنے کھڑے ہو جاؤ تاکہ میں آڑ میں آسانی سے اپنا کام کر سکوں۔"

تالا واقعی اچھے قسم کا تھا۔ بہت دیر میں کھلا۔ کارٹر نے اندر جاتے ہوئے کانسٹیبل سے کہا۔

"اب تم یہاں سے چلے جاؤ، مگر زیادہ دُور نہ جانا۔ اور جب میں بلاؤں۔ فوراً آجانا۔"

برقی لیمپ کی روشنی میں چاروں طرف ایک سرسری نظر ڈالتے ہی کارٹر نے یہ معلوم کر لیا کہ کاروبار کا محض حیلہ ہے۔ درحقیقت اس کے کرایہ دار نے لوگوں کو دھوکہ دینے کے واسطے اسے دفتر بنا رکھا ہے۔ کمرہ کے اندر نشست کی جانب ایک اور کمرہ تھا۔ کمرہ میں ایک معمولی میز اور ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ جس پر سیروں خاک تھی۔ دوسرے کمرے میں گیا۔ یہاں بھی سوائے ایک میز، ایک کرسی اور ایک بڑی الماری کے کچھ نہ تھا۔ میز کی درازیں کھولیں۔ الماری کے خانے دیکھے۔ لیکن سوائے ایک خالی شراب کی بوتل کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔ مایوس ہو کر پلٹا تھا۔ کہ آتشدان پر نظر پڑ گئی۔ راکھ اور مختلف قسم کی جلی ہوئی چیزوں

کا ایک انبار نظر آیا۔ بغور دیکھا تو لوہے کے چھلے۔ بٹن۔ کاغذ اور جلے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ان چیزوں سے کارٹر کے واسطے یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ مختلف قسم کی چیزیں حال ہی میں یہاں جلائی گئی ہیں۔ اور ہو نہ ہو یہ وہی ڈاک کا تھیلا اور وردیاں ہیں۔ جس کی تحقیقات نے اسے پریشان کر رکھا ہے۔ مگر وہ ہنوز کسی ایسے ثبوت کے فراہم کرنے میں ناکام تھا جو اس کے شکوک اور مشتبہ جرم کے الزام کو قوی بناتا۔ ابھی وہ اسی کشمکش میں تھا۔ کہ صدر دروازہ کے تالے میں کنجی گھمانے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ فوراً لیمپ بجھا کر جیب میں رکھا اور دروازہ بند کر کے خاموشی سے آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی شخص داخل ہوا۔ ساتھ ہی دوسرے آدمی کے پاؤں کی آہٹ ہوئی۔ اور وہ بھی اندر آگیا۔ معلوم ہوا کہ دو آدمی ہیں۔ اب کارٹر کا خوف اور پریشانی لحظہ بہ لحظہ ترقی کر رہی تھی۔ اور عقل کسی نتیجہ پر پہنچنے سے عاجز تھی۔ نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن۔ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ پہلے کمرے یکایک باتوں کی آواز آئی۔ ایک نے دوسرے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کربی۔ تم سخت احمق آدمی ہو۔ میں نے تاکید کر دی تھی۔ کہ دو ایک دن خاموشی سے بیٹھے رہو۔ مگر تم نے نہ مانا۔ اور لطف یہ کہ شارع عام پر مجھ سے الجھنے لگے۔ اگر میں چاہوں تو ابھی تمہیں جہنم کا راستہ دکھا سکتا ہوں۔"

ان الفاظ کے جواب میں دوسرے نے کہا۔

تم نے مجھے میری مرضی کے خلاف اس کام پر آمادہ کیا۔ اور اب دھوکا دینا چاہتے ہو۔ میں آرام اور خوش وضعی سے اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر تم نے زبردستی

مجھے اس مصیبت میں گرفتار کرا دیا۔ اب میں ایک منٹ اس شہر میں ٹھہرنا نہیں چاہتا۔"

"دیکھو کہنا مانو۔" پہلے آدمی نے کہا۔ "اپنے کام پہ لگے رہو۔ ہم لوگ ذرا بھی مشکوک نہیں ہیں۔ اور پولیس بالکل بے وقوف بنی ہوئی ہے۔ دو چار روز بس ہم لوگ خاموشی سے کہیں چلدیں گے۔"

"نہیں۔" کرلی نے جواب دیا۔ "میں اب ایسا نہیں کر سکتا۔ میرے کمرے کی ضعیفہ کہتی ہے کہ رات کو خود بخود میں سوتے میں بکتا ہوں۔ ایسی صورت میں یقینی ایک دن یہ راز طشت از بام ہو جائے گا۔ آخر تمہیں میرا حصہ دینے سے کیوں انکار ہے۔ تم نے خود کہا ہے کہ دونوں موتی تمہارے پاس ہیں۔ ایک مجھے دے دو۔ میں جدھر چاہوں گا چلا جاؤں گا۔ پلینٹ لللہ مجھ پر رحم کرو یہ حالت میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔"

پلینٹ نے غصہ سے بیتاب ہو کر کہا۔

"جو کچھ میں کہتا ہوں۔ تمہیں کرنا ہوگا۔"

"تم جو کچھ کہتے ہو میں کبھی نہ کروں گا۔" کرلی نے جواب دیا۔ "اب صاف صاف کہتا ہوں۔ اگر تم نے میرا حصہ دیدیا تو خیر ورنہ سیدھا پولیس اسٹیشن چلا جاؤنگا۔

نک کارٹر ان کی گفتگو سننے کے علاوہ نہایت ہوشیاری سے ان کی حرکتیں بھی دراز سے دیکھ رہا تھا۔ کرلی کا فیصلہ کن جواب سنتے ہی پلینٹ کا صبر و قرار جاتا رہا۔ غصہ میں جامہ سے باہر ہو گیا۔ شکاری کتے کی طرح جھپٹ کر کرلی کی گردن پکڑلی۔ کرلی بھی گو جسمانی حالت میں اس سے نحیف اور قوت میں کمزور تھا۔ تاہم

موم کا بنا ہوا نہ تھا۔ وہ پینیٹ کی حرکتوں سے بخوبی واقف اور ایسے ناخوش گوار نتائج سے کافی باخبر تھا۔ چشم زدن میں اس نے جیب سے پستول نکالا اور پینیٹ کے سینے کو نشانہ بنا کر فیر کر دیا۔ آواز سنتے ہی کارٹر بجلی کی طرح دونوں کے بیچ میں پہنچ گیا۔ کرلی کو دھکا دیکر علیحدہ کیا۔ اور پینیٹ کو سنبھالا مگر اس کی اعانت بالکل بے سود تھی۔ گولی اپنا کام کر چکی تھی۔ اور پینیٹ دم توڑ رہا تھا۔ کارٹر نے آہستگی سے زمین پر لٹا دیا پلٹ کر دیکھا کرلی بھی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

اسی وقت دروازہ کھلا۔ ولسن اور کانسٹیبل کمرہ میں داخل ہوئے۔ کارٹر نے کہا۔ پینیٹ اور کرلی دونوں موجود ہیں۔ پینیٹ مر چکا ہے اور کرلی دم توڑ رہا ہے۔"

کارٹر نے یہ کہتے ہوئے پینیٹ کی جیبوں کا جائزہ لیا اور مسرور لہجہ میں ولسن سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے۔ دونوں موتی محفوظ ہیں۔ پولیس کو ٹیلیفون کر دو۔ کہ لاشوں کے اٹھانے کا انتظام کرے"۔

کارٹر نے مذہبی رسم کے بموجب پینیٹ اور کرلی کے سروں سے ٹوپیاں علیحدہ کر دیں ÷

❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

تھانیدار

بھلا اس میں ہمارا کیا قصور کہ خداوند عالم نے ہمیں چھ فٹ کا قد اور پورے چھتیس انچ کا سینہ عنایت فرمایا ہے۔ شکل و صورت میں رعب و دبدبہ کا یہ عالم ہے کہ ہم نے گھر سے باہر قدم نکالا اور چاروں طرف سے سلام کی بارش ہونے لگی۔ ہاں اِس سلسلہ میں ہم سے ایک غلطی ضرور ہوئی۔ یعنی لکھنو کے زمانہ قیام میں جسے غالباً دس سال کا عرصہ ہوا۔ نخاس کی بازار میں ایک استعمالی مگر ہر طرف سے مضبوط برجس تین آنے میں خرید لی۔ جسے عموماً ہم شکار میں استعمال کیا کرتے تھے۔

یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ بدقسمتی سے ہم نے اس طلسمی برجس کو اجمیر کے سفر میں زیب ٹانگ کر لیا اور بغیر کسی خیال کے حسب معمول تھرڈ کلاس میں داخل ہوگئے۔ مسافروں کی یورش سے ہاتھ پاؤں بچاتے کبھی آگے بڑھتے۔ کبھی پیچھے ہٹتے ہوتے بالآخر ایک کنارے والی سیٹ پر قابض ہوگئے۔

ابھی ہم بیٹھے بھی نہ تھے۔ اور غور ہی کر رہے تھے کہ اٹیچی کیس اور بستر کہاں رکھیں کہ یکایک سامنے والی سیٹ سے ایک لمبا تڑنگا آدمی سیدھا کھڑا ہو گیا اور ہمارے ہاتھ سے اٹیچی کیس اور بستر قریب چھینتے ہوئے بولا۔ "لائیے حضور یہ مجھے دیجئے میں رکھدوں۔ آپ تکلیف نہ کریں میں ابھی سب سامان کئے دیتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس فرشتہ خصلت انسان نے اٹیچی کیس اوپر رکھا اور بستر کھول کر نہایت قاعدے سے بنچ پر بچھا دیا۔ اور کہا۔ "لیجئے حضور اب اطمینان سے آرام کیجئے۔ میں اس طرف کسی کو قدم نہ رکھنے دونگا"۔

× × × × ×

جملہ کارروائی کچھ اس سرعت اور غیر معمولی انداز سے عمل میں آئی۔ کہ مجھے شبہ ہونے لگا۔ کہ آیا میں واقعی ریل میں سفر کر رہا ہوں یا عالم خواب میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ خدایا یہ آدمی جس سے معمولی شناسائی بھی نہیں۔ بلا وجہ مجھ پر اس قدر کیوں مہربان ہے۔ اور مجھے کیوں قابلِ احترام خیال کر رہا ہے۔ کہ حضور کے سوا کسی دوسرے لفظ سے مخاطب ہی نہیں کرتا۔ میں چپکے سے بستر پر بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر غور کرنے لگا۔ کہ آخر اس آدمی کو میرے ساتھ اس قدر کیوں ہمدردی ہے۔ اگر یہ کسی وقت میں میرا ملازم رہ چکا ہے۔ تو اب تک مجھے پہچان لینا چاہئے تھا۔ اگر یہ میرے باپ دادا کے یہاں ملازم تھا۔ تو اپنا تعارف کراتا۔ ہو نہ ہو۔ یقیناً یہ ان شاطر چوروں میں ہے جو ہمیشہ سیدھے سادے مسافروں کو اسی طرح بیوقوف

بنا کر ان کا مال و اسباب نو دو گیارہ کر دیا کرتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے اس کمبخت پر غصہ آنے لگا۔ وہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ میرا مال و اسباب خطرہ میں تھا۔ کیونکہ بستر پر لیٹا تھا اس کا لے جانا محال ہی نہیں غیر ممکن تھا۔ اٹیچی کیس میں سوائے ایک جوڑہ کپڑے کے اور کچھ نہ تھا۔ رہے پچیس روپے اور سوا تین آنے پیسے یہ نہایت احتیاط سے منی بیگ میں مقید تھے۔ جو بر جس کی ایک پاکٹ میں مع ایک ہاتھ کے موجود تھا۔ ایسی صورت میں غصہ محض اس بات پر آ رہا تھا کہ اس منحوس نے آخر اتنے مسافروں میں مجھی کو سیدھا سمجھ کر بیوقوف بنانے کے واسطے کیوں منتخب کیا۔ اور اس غصے نے میرے لب و لہجہ میں کچھ سختی اور خشونت پیدا کر دی۔ چونکہ مجھے اٹیچی کیس کی حفاظت کا خیال بے چین کر رہا تھا۔ اس لئے میں نے ترش رُو ہو کر کہا۔ "اٹیچی کیس تم نے اوپر کیوں رکھ دیا۔ لاؤ اسے سرہانے رکھ دو میں لیٹوں گا" ابھی الفاظ اچھی طرح ختم بھی نہ ہونے پائے تھے کہ اٹیچی کیس میرے سر کے نیچے تھا۔ اور انتہائی ادب سے گڑگڑاتے ہوئے بولا "حضور میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا۔ کہ آپ آرام فرمائیں۔ میں کسی کو اس طرف نہ آنے دونگا۔"

× × × × × ×

اس واقعہ نے میرے رہے سہے شکوک بھی رفع کر دیئے۔ اور پھر وہی پہلے والی الجھن شروع ہو گئی۔ آخر یہ آدمی ہے یا کسی کے بھیس میں اُمیر سا تھا اس قدر ہمدردی کی وجہ کیا ہے۔ ہنوز اسی چکر میں تھا کہ ٹرین جھنیک اسٹیشن پر ٹھہری۔ اور مسافروں نے بے تحاشہ حملہ شروع کر دیا۔

حسب معمول کوئی ادھاری کاندھے پر لٹکائے۔ کوئی گٹھڑی سر پر رکھے۔ کوئی بستر بغل میں دبائے۔ کوئی عورت کا ہاتھ تھامے بچہ گود میں لئے درجہ میں جگہ ہو نہ ہو گھسا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ ہمارا درجہ بھی اس آفت سے مستثنےٰ نہ تھا۔ یہاں بھی دھکیلم دھکیل بلکہ خاصی دھینگا مشتی ہو رہی تھی۔ اسی دھما چوکڑی میں کچھ لوگوں نے میری سیٹ کیطرف بھی رُخ کیا۔ اور مجھ کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے، ابھی یہ غریب مسافر کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ آیا مجھ سے اٹھ کر بیٹھنے کا مطالبہ کریں یا نہ کریں کہ ہمارے ہمدرد صاحب یکایک کڑک کر بولے "خبردار ادھر آنے کا ارادہ نہ کرنا۔ یہاں تھانیدار صاحب آرام کر رہے ہیں۔

× × × × × ×

ان الفاظ کا ان مسافروں پہ کیا اثر ہوا مجھے خبر نہیں۔ یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ دماغ اپنا کام کرنے سے عاجز ہے۔ جب حواس ٹھکانے ہوئے تو ٹرین پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ اور درجہ میں کوئی گڑبڑ نہ تھی۔ لیکن میرے کانوں میں ہنوز آواز آ رہی تھی "یہاں تھانیدار صاحب آرام کر رہے ہیں" اب سارا راز آئینہ تھا۔ معلوم ہوا کہ ان حضرت کا سارا جوش ہمدردی صرف اس غلط فہمی پر منحصر تھا۔ کہ میں تھانیدار ہوں۔ جس کا ثبوت اس کے پاس سوائے اس نخاس والی برجس کے اور کچھ نہ تھا۔ آفرین ایسی تھانیداری پہ اور مرحبا ایسے پہچاننے والوں پہ۔

اب میرے واسطے ایک دوسری مصیبت کا سامنا تھا۔ یعنی اس کمبخت نے مجھے خواہ مخواہ تھانیدار تو بنا دیا تھا۔ لیکن یہ تھانیداری اگر خوش نصیبی سے برجیس ہی تک محدود رہے تب تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اگر تھانیداری نے زیادہ وسعت اختیار کی تو کیا ہوگا۔ اس معمہ کو حل کرنے کے لئے اپنا دماغ اس قدر معطل اور بیکار تھا کہ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ جناب بھی تھانیداری کے خوف سے فرار ہو کر کھوپڑی سے برجیس کی کسی جیب میں آگئے ہیں۔

اس لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ سیٹ پر خاموش لیٹا ہوا اسی طرح تھانیدار بنا رہوں۔ اور نتائج کو محض برجیس کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ خاموشی اس لئے ضروری تھی کہ سوائے ان میاں سپاہی کے دوسرا قابل خطاب نہ تھا۔ اور ان حضرت سے بات چیت کرنا میرے لئے دونوں صورتوں میں خطرناک تھا۔ اول تو ایک کانسٹیبل سے گفتگو کرنا تھانیداری کے شایانِ شان نہ تھا۔ دوسرے اس کا اندیشہ تھا کہ اگر اس نے محکمہ کی پیچیدگیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی اینڈا بینڈا سوال کر دیا۔ تو ساری قلعی کھل جائے گی۔ اور سخت رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

× × × × × ×

ابھی میں سونے اور جاگنے کی درمیانی حالت ہی میں تھا کہ ٹرین اٹاوہ پہنچ گئی۔ اور حسبِ معمول مسافروں کی یورش شروع ہو گئی۔

ہمارے کرم فرما سپاہی صاحب کچھ دیر تک توپے درپے حملوں کی مدافعت کرتے رہے۔ اور جہاں تک گنواروں کا تعلق تھا۔ انہیں اس جدوجہد میں کامیابی بھی ہوئی لیکن بدنصیبی سے ایک مختصر سا گروہ اسکول کے طلبا اور ایک عدد مولوی صاحب کا بلائے ناگہانی کی طرح ہمارے درجہ میں نازل ہو گیا۔ چونکہ میں لیٹا ہوا پوری سیٹ پر قابض تھا اس لئے قدرتاً اس پارٹی نے مجھے بُری طرح گھورنا شروع کیا۔ دو ایک لونڈوں نے آگے بڑھنا چاہا۔ اور سپاہی صاحب نے میری تھانیداری کا واسطہ دیکر ان کے اس اقدام کو روک دیا۔ لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اسکولوں کا یہ گروہ شیطانی کب باز آنے والا تھا۔ فوراً ایک اخلاقی سوال پیش کر دیا گیا۔ کہ "ہم لوگ بچے ہیں کھڑے رہیں گے کم از کم ہمارے مولوی صاحب کو تو بیٹھ جانے دیجئے"۔ ظاہر ہے کہ اب میرے لئے بے حس وحرکت خاموش پڑا رہنا ناممکن تھا۔ مجبوراً آنکھیں کھولدیں۔ اور پاؤں سمیٹ کر بولا۔ "آئیے مولانا تشریف رکھئے"۔ مولانا احسان مندانہ انداز میں کھیسیں نکالتے ہوئے میرے پائنتی بیٹھ گئے۔ حالانکہ انگریزی اسکول میں فارسی پڑھانے والا مولوی اپنے زہد وتقوےٰ کے اعتبار سے اتنا واجب احترام نہیں ہوتا جتنا ایک مسجد کا ملّا۔ تاہم میرے ضمیر نے یہی فیصلہ کیا کہ مولوی بہرحال مولوی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لونڈے تو اس تاک میں تھے ہی ایک ایک کر کے سب نے بنچ پر قبضہ کر لیا۔ خیر یہ صورت بھی میرے لئے چنداں تکلیف دِہ نہ تھی لیکن جو چیز اس وقت تک میرے قلب ودماغ

کے لئے اذیت رساں تھی۔ اس سے پیچھا چھڑانا میرے لئے دشوار ہو گیا۔ یعنی میری تھانیداری، جس کا اظہار اس کمبخت کانسٹیبل نے ان لوگوں کے سامنے بھی کر دیا تھا۔ اس لئے ان کے سامنے بھی میرا خواہ مخواہ تھانیدار بنا رہنا ناگزیر تھا۔ خصوصاً جب کہ "قاضی کے مرو کی طرح" حضرت ہنوز سر پہ مسلط تھے

× × × × × ×

اس مصیبت سے بچاؤ کی اختیاری صورت میرے لئے سکوت تھا، جو ہنوز قائم تھا۔ لیکن دوسروں کی زبان پر آرڈیننس لگانا میرے اختیار سے باہر تھا۔ چنانچہ ٹرین نے ابھی اٹاوہ کے حدود بھی طے نہ کئے تھے۔ کہ مولانائے محترم نے ایک عدد سوال جڑ دیا۔ "آپ آج کل کہاں تعینات ہیں؟" جی تو یہی چاہا کہ کہہ دوں "اس کمبخت کانسٹیبل کی کھوپڑی میں تعینات ہوں" لیکن مصلحتاً نہایت لاپروائی سے کہہ دیا۔ "کانپور میں" "کہاں تشریف لئے جا رہے ہیں؟" "اجمیر" "غالباً سرکاری کام ہے" "جی ہاں" ستم یہ تھا کہ میری بے رخی اور لاپرواہی تھانیداری کا مزید ثبوت فراہم کر رہی تھی۔ کیونکہ عام طور پر اس محکمہ والوں کا اخلاق کچھ اسی انداز کا ہوتا ہے۔ لیکن اس نمایاں بداخلاقی کے باوجود مولانا نے ہمت نہیں ہاری "آگرہ ہو کر جائیے گا یا دہلی" "آگرہ" "بڑی خوشی کی بات ہے ہم لوگ بھی آگرہ ہی جا رہے ہیں" لاحول ولا قوۃ میں نے تو اس لئے آگرہ کہہ دیا تھا۔ کہ شاید یہ قافلہ دہلی کی طرف جا رہا ہے۔ جس سے ٹونڈلہ اسٹیشن پر چھٹکارہ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن نہیں معلوم ہوا کہ ابھی مقدر میں کچھ اور لکھا تھا۔ میں اپنی غلطی پر دل میں افسوس ہی کر رہا تھا کہ مولانا نے ایک اور سوال رسید کیا "آگرہ میں جناب کہاں

قیام فرمائیں گے"۔ "اسٹیشن پر یا کسی ہوٹل میں"۔ "گستاخی معاف۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا"۔ ایک صاحبزادے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "یہ آگرہ کے روسا میں ہیں۔ ہم لوگ بھی ان کے مہمان ہیں اور آپ کو بھی وہیں قیام کی زحمت دی جائے گی۔" "مولانا مجھے جلد سے جلد اجمیر پہنچنا ہے۔ آپ کی مہمان نوازی سے ممنون ہونے کا موقع نہیں"۔ "لیکن اجمیر کے لئے جلد پہنچانے والی کوئی گاڑی کل نو بجے سے پہلے نہیں مل سکتی۔ اس لئے یہ رات اور کل کا دن آپ کے لئے بیکار ہے"۔ اب میں اس دروغ ساز کانسٹیبل سے مخاطب ہوا۔ "کیوں جی تم کہاں جاؤ گے"۔ "حضور میں تو ٹونڈلہ اتر جاؤں گا"۔ پتہ چلا کہ اب مجھے تاڑ سے چھوٹ کر ببول میں الجھنا پڑے گا۔ ان ذاتِ شریف سے تو خیر ٹونڈلہ میں نجات مل جائے گی۔ مگر مولانا اور ان کے شاگردانِ رشید سے پیچھا چھوٹنا دشوار ہے۔

× × × × × ×

ٹونڈلہ پہنچتے ہی سپاہی صاحب کورنش اور آداب بجا لا کر رخصت ہو گئے۔ اور مولانا کو اپنا جانشین بنا کر چھوڑ گئے۔ لونڈوں نے مجھے اٹیچی کیس اور بستر سے سبکدوش کر دیا۔ آگرہ کی ٹرین تیار تھی۔ کچھ انتظار کے بعد یہ مرحلہ بھی ختم ہو گیا۔ اور تقریباً گیارہ بجے رات کو آگرہ پہنچ گئے۔ طوعاً و کرہاً مجھے مولانا کے ساتھ ہی خواہ مخواہ کا مہمان بننا پڑا۔ رات تو میں نے جوں توں بسر کی۔ صبح کو ناشتہ کے بعد گو مولانا کا اصرار تھا کہ تاج اور اعتماد الدولہ وغیرہ دیکھنا چاہیئے لیکن کسی شناسا سے مڈبھیڑ ہو جانے کے خوف نے مجھ سب انسپکٹری محکمہ

دینے کے لئے مجبور کیا۔ میں نے بہت سنجیدگی سے کہا: "مجھے رپورٹ تیار کرنا ہے۔ کسی تخلیہ کی جگہ کا انتظام کرا دیجئے۔ اور ہمراہ چلنے سے معاف فرمایئے۔" مجبوراً مولانا کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور میں علیحدہ کمرے میں نہایت اطمینان سے بارہ بجے تک سوتا رہا۔ ایک بجے کے قریب یہ گروہ شیطانی مع اپنے سالار کے واپس آیا۔ اور دو بجے تک کھانے وغیرہ سے فرصت پاکر میں نے سواری منگانے کی درخواست کی۔ میزبان صاحب نے فرمایا۔ سواری کی ضرورت نہیں۔ گھر میں کار موجود ہے۔ خدا خدا کرکے ڈھائی بجا اور میں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ مولانا نے فرمایا "اکثر کانپور جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ نیز میں وہاں تبادلہ کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔ اس لئے یقین ہے۔ شرف قدمبوسی حاصل کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔" "جی۔ میرے لئے آپ کی تشریف آوری باعث فخر ہوگی۔" زبان سے تو ضرور یہ کہدیا۔ مگر دل میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ سٹیشن تک خیریت سے پہنچ جانے دیجئے۔ اس کے بعد اگر خدا نے چاہا تو آپ کے فرشتے بھی مجھے تلاش نہ کر سکیں گے۔ نام اور پتہ جو میں نے بتالیا ہے۔ اگر حسن اتفاق سے کوئی سب انسپکٹر اس نام کا ہندوستان میں ہے۔ اور آپ وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو "شرف قدمبوسی" حاصل ہونے کی بجائے اگر آپ دھوکا دینے کے جرم میں چالان سے بچ جائیں۔ تو اسی کو غنیمت سمجھئے گا۔

× × × × × ×

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اجمیر کی ٹرین میں سوار ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس عذابِ جان برقعہ کو نذر

جسم سے علیحدہ کر دیا گیا بلکہ ہمیشہ کے لئے اسے خیر باد کہہ دینا پڑا۔

* * * * * *

پگڑی

مسٹر فریرا نے چیں بجبیں ہو کر منتجیانہ انداز میں کارڈ کو دیکھا۔ اور بڑبڑاتے ہوئے چپراسی سے بولے۔

"علی صاحب کو اندر بھیج دو۔"

ایک دبلا پتلا۔ نحیف و لاغر۔ پستہ قد۔ نوعمر آدمی معمولی سوٹ پہنے اندر آیا۔ اور ملتجیانہ انداز میں سلام کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔ غریب کو اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ بغیر اجازت کرسی پر بیٹھ جاتا۔ مسٹر فریرا نے ملاقاتی کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور خشک لہجے میں ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"رحمان علی صاحب آپ ہی کا نام ہے۔ تشریف رکھئے۔ کہئے کیا کام ہے"؟

رحمان علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پست آواز میں ڈرتے ڈرتے کہا۔
"میں نے سنا ہے کہ بائی کلا میں آپ کے ایک مکان کی تیسری منزل کرایہ کے لئے خالی ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"یہ نہ پوچھئے۔" رحمان علی نے پھیکے تبسم کے ساتھ جواب دیا۔ "غرضمند کو اسی لئے باؤلا کہتے ہیں کہ وہ اپنی غرض کے لئے نہیں معلوم کیا کیا کرتا ہے۔ نہ کہ یہ معلوم کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ مسٹر فریرا اگر معاملہ صرف تنہا میرے رہنے کا ہوتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ کسی دوست کے یہاں بسر کر لیتا لیکن مصیبت یہ آپڑی کہ ایک ہفتہ ہوا بیوی بچے کو بھی لاہور سے لے آیا۔ اور ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہوں۔ اب آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ کہ میرا ایسا متوسط الحال آدمی زیادہ عرصہ تک ہوٹل کے مصارف برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اس میں تو شبہ نہیں لیکن بغیر مکان کا انتظام کئے بیوی بچوں کو لانے کی آپ نے حماقت کیوں کی؟"

لاعلمی کی صورت میں یقیناً آپ اسے حماقت کہنے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں حکومتِ ہند کے محکمہ اتل سیڈ میں ملازم ہوں۔ چند ہفتے ہوئے محکمہ نے اعلان کیا کہ سنیئر اسٹاف کو مکانات حکومت کی جانب سے مہیا کئے جائیں گے۔ چونکہ میرا شمار بھی سنیئر اسٹاف میں تھا۔ اس لئے رخصت لے کر بال بچوں کو لے آیا۔ بدنصیبی سے عین موقع پر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ کہ آیا میرا شمار سنیئر اسٹاف میں ہو سکتا ہے یا نہیں۔ فیصلہ میرے خلاف ہوا۔ اور

مجھے مکان کی نوازش سے محروم کر دیا گیا۔

مسٹر فریرا مسکراتے ہوئے اپنی گھومنے والی کرسی سے اٹھے اور رحمان علی کے نزدیک آکر میز کے کونے پر بیٹھتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولے۔

"میاں صاحبزادے شاید تم کو علم نہیں بمبئی میں یہ معلوم کر لینا کہ فلاں مکان خالی ہے بہت آسان ہے لیکن اُسے حاصل کرنا بہت دشوار۔ اس لئے کہ ان دونوں باتوں کی نوعیت بالکل الگ ہے۔"

"مجھے اس کا بخوبی علم ہے۔ رحمان نے جواب دیا" میں جانتا ہوں کہ مکانوں کے حصول میں سب سے بڑا اور پہلا سوال پگڑی (نذرانہ) کا ہوتا ہے۔ مسٹر فریرا اس میں کلام نہیں۔ کہ میری مالی حالت بہت کمزور ہے۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ مکان کی ضرورت نے مجھے ہر طرح مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے میں پگڑی کے سلسلے میں دو ہزار روپے تک دینے میں دریغ نہ کروں گا۔"

دو ہزار کا جملہ سُن کر مسٹر فریرا کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ انہیں اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ کہ یہ معمولی سا آدمی اتنی کثیر رقم ادا کرنے پر آمادہ ہو جائیگا۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ حصہ مکان کم وبیش تین مہینے سے خالی پڑا تھا۔ اور جو کرایہ دار بھی اس وقت تک آیا۔ اس نے پندرہ سو سے زیادہ پیش نہیں کئے۔ ایسی صورت میں بھلا مسٹر فریرا کے واسطے انکار کا کیا موقع تھا۔ مسرور لہجہ میں کہا۔

"میاں رحمان، مکان تمہارا ہو چکا۔ کرایہ پینسٹھ روپیہ ماہوار ہوگا۔ اور واضح رہے کہ یہ رقم کنٹرول ریٹ کے مطابق ہے۔"

"بیشک۔ بیشک۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کرایہ کے معاملے میں خلاف ورزی

نہیں کر رہے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ ایک ماہ کا پیشگی کرایہ اور نذرانہ کی رقم ابھی لے لیجیے۔"

"پگڑی کہیے، پگڑی" مسٹر فریرا نے مذاقیہ انداز میں کہا۔ اور نوٹوں کو دراز میں مقفل کرتے ہوئے بولے "کرایہ کی رسید میں بھی آپ کو ابھی دیتا ہوں۔"

× × × × × ×

رحمان علی کو رسید لے کر رخصت ہوئے ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ چپراسی نے ایک دوسرا کارڈ پیش کیا۔ موٹا اور بھدا چہرہ خشم آلود ہو گیا۔ "کیا پھر کوئی ملاقاتی نازل ہو گیا۔ کہہ دو۔ میں بے حد مصروف ہوں۔ یکا یک کارڈ پر نظر پڑ گئی۔ سارا غصہ کافور ہو گیا۔ گھبرا کر چپراسی سے بولے۔

"ٹھہرو۔ میں مس نرگس سے ملوں گا۔ انہیں اندر بھیج دو۔"

ایک اٹھارہ انیس سال کی دراز قامت لڑکی۔ ہلکے سبز رنگ کی ساڑھی میں ملبوس۔ اٹھلاتی مسکراتی کمرے میں داخل ہوئی۔ جس کی بلند و کشادہ پیشانی سیاہ گھونگر والے بال۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور بلوریں نازک ہاتھ دیکھ کر مسٹر فریرا کے حواس جاتے رہے۔ کمرے کی فضا میں انقلاب نظر آنے لگا۔ آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ قوت گویائی سلب ہو گئی۔ تصویرِ حیرت بن کر رہ گئے۔ اس انتشار و گھبراہٹ میں بھی ایک خیال ضرور نہایت شدت سے دماغ میں آ رہا تھا۔

"کاش میری عمر رفتہ چند منٹ ہی کے لئے واپس آ سکتی۔"

"آداب عرض مسٹر فریرا۔" مس نرگس کی سریلی آواز نے مسٹر فریرا کو چونکا دیا۔ "جناب کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت کے چند منٹ مجھے

عنایت فرمائیے۔ میں اس وقت ایک اہم مسئلہ میں آپ کی اعانت و ہمدردی کی تمنا لے کر حاضر ہوئی ہوں۔"

"فرمائیے۔ کیا حکم ہے۔ آپ کی خدمت تو میرے لئے باعثِ عزت ہے۔"

"شکریہ۔ مجھے آپ کے اخلاق سے ایسی ہی توقع ہے۔ آپ کو میرے کارڈ سے معلوم ہوا ہوگا۔ کہ میں ایک ادارۂ رقص کی مالک ہوں۔ آپ کی دعا سے دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ نئے طلبار کی یورش نے موجودہ جگہ کو بالکل ناکافی بنا دیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بانگلا میں آپ کے مکان میں ایک حصہ خالی ہے۔ جسے میں اپنی ضروریات کے لئے نہایت موزوں اور مناسب سمجھتی ہوں۔"

مسٹر فریرا کو محسوس ہوا کہ یکایک ان کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ افسوس کیا اچھا ہوتا کہ یہ لڑکی آدھ گھنٹہ پہلے آئی ہوتی۔ اور میں اسے مایوس نہ کر سکتا۔ بمشکل اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"مس صاحبہ۔ دراصل واقعہ یہ ہے۔ کہ ......"

"لے بس رہنے دیجئے۔" مس نرگس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مسٹر فریرا چونکہ میں بھی ایک تجارتی عورت ہوں۔ اس لئے ان معاملات کا مجھے بخوبی احساس ہے۔ آپ اطمینان رکھئے۔ میرا ادارہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اور جب مجھے اپنے روزگار سے آمدنی ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ میں دوسرے ہم پیشہ کے حقوق کو نظر انداز کروں۔ پگڑی کی طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیں میں پانچ ہزار تک دینے کو تیار ہوں۔ للّٰہ مجھے مایوس نہ کیجئے۔"

اب مسٹر فریرا کو عجب کشمکش کا سامنا تھا۔ اوّل تو ایسا طرحدار کرایہ دار۔ دوسرے ایسی زبردست رقم کی پیشکش۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے بولے۔

"سمجھ میں نہیں آتا۔ آپکو کیسے بتاؤں کہ یہ حصہ مکان اب خالی نہیں ہے۔ آدھ ہی گھنٹہ ہوا کہ رحمان علی ایک صاحب جو غالباً کسٹم آفس میں ملازم ہیں۔ اسے کرایہ پر لے چکے ہیں۔ اور پیشگی کرایہ بھی جمع کر گئے ہیں۔"

"افسوس۔" مس نرگس نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "جہاں جاتی ہوں۔ مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ مسٹر فریرا کیا واقعی اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اس آدمی سے اب بھی انکار کر دیں۔"

"کاش میں ایسا کر سکتا۔" مسٹر فریرا نے مایوسانہ لہجہ میں جواب دیا۔ "میں تو اس کمبخت کو رسید بھی دے چکا۔ آپ ہی فرمایئے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"خیر، مجبوری ہے۔" مس نرگس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کہیں اور قسمت آزمانا پڑے گی۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے۔ "بہرحال میرا فون نمبر نوٹ کر لیجئے۔ اور حسنِ اتفاق سے کوئی موقع نکل آئے۔ تو فوراً مجھے اطلاع دے دیجئیگا۔"

× × × × × ×

رحمان علی کے واسطے یہ چیز واقعی پریشانی اور ندامت کا موجب تھی کہ اُسے بار دیگر اُسی دن پھر مسٹر فریرا کے پاس آنا پڑا۔ لیکن وہ غریب حالات سے مجبور تھا۔ دو ہزار کی رقم ایسی نہ تھی کہ اسے محض نمائشی اخلاق کے دباؤ کی وجہ سے مسٹر فریرا ایسے حریص و ظالم شخص کو بخش دی جاتی۔ بلکہ اس کی بازیابی کے واسطے ہر امکانی

کوشش کرنا وہ اپنا فریضہ حیات سمجھ رہا تھا۔ یہ اُس کی خوش نصیبی تھی۔ کہ مسٹر فریرا بھی بدلے ہوئے واقعات کے ماتحت یہ رقم واپس کرنے کو تیار تھے۔ ورنہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میاں رحمان علی کو اس وقت کس مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا۔ بہرصورت رحمان علی کی استدعا سننے کے بعد مسٹر فریرا نے بظاہر خشک لہجے میں کہا۔

"تو اب آپ کو مکان کی ضرورت نہیں رہی۔ اور رقم کی واپسی چاہتے ہیں"۔

"میں عرض کر چکا ہوں کہ آپ سے رخصت ہو کر جب دفتر پہنچا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ واقعات نے پھر پلٹا کھایا۔ اور میرا شمار سینئر اسٹاف میں ہو سکتا ہے اس لئے میں مکان پانے کا بھی مستحق ہوں۔ مجھے اعتراف ہے۔ کہ میری اس غیر معمولی استدعا سے یقیناً آپ کو تکلیف پہنچی۔ لیکن آپ ہی میری حیثیت کا اندازہ کرتے ہوئے انصاف فرما سکتے ہیں۔ کہ دو ہزار کی رقم میرے لئے کیا چیز ہو سکتی ہے۔ رہی پیشگی کرایہ کی رقم۔ اسے میں چھوڑنے کے واسطے تیار ہوں"۔

مسٹر فریرا نے ساری سرگزشت سننے کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ اور بظاہر بڑے سوچ میں پڑ گئے۔ حالانکہ دل میں کہہ رہے تھے کہ اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کیا ہو گی۔ علاوہ دو ہزار کے اگر یہ شخص کچھ زیادہ طلب کرتا۔ اور مکان نہ لیتا۔ تو بھی شاید مجھے عذر نہ ہوتا۔ نہ کہ یہ احمق تو ایک مہینہ کا پیشگی کرایہ بھی چھوڑ رہا ہے۔ کئی منٹ کے بعد ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بولے۔

"میاں رحمان یہ تمہارے مقدر کی خوبی ہے کہ تمہارا سابقہ مجھ جیسے مکان دار سے پڑا۔ جو روپیہ کی قطعی پرواہ نہیں کرتا۔ اور ہر طرح کرایہ دار کو خوش رکھنا چاہتا

ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو گردن ناپ کر باہر نکال دیتا۔ یہ لو تمہارے دو ہزار روپے واپس ہیں۔ سنبھال لو۔"

"جناب کی بندہ نوازی کا شکریہ"۔ رحمان نے بعجلت نوٹوں کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "سچ تو یہ ہے مجھے آپ سے ایسی ہی توقع تھی ورنہ حاضری کی جرأت بھی نہ کرتا۔"

رحمان علی کے رخصت ہوتے ہی مسٹر فریرا نے مس نرگس کا ٹیلیفون نمبر ملایا۔ اور دریافت کیا۔

"ہیلو۔ کیا مس نرگس تشریف رکھتی ہیں۔........

"اچھا۔ آپ ہی بول رہی ہیں۔....... میں آپ کو خوشخبری دینا چاہتا ہوں۔ کہ جس مکان کو حاصل کرنے کی خواہشمند تھیں۔ وہ اب خالی ہے۔ اور آپ کو مل سکتا ہے۔"

"یہ کیسے"۔ کسی نے دلکش اور مسرور لہجہ میں سوال کیا۔

مسٹر فریرا خوش ہو ہو کر جب سارا قصہ سنا چکے۔ تو پھر پوچھا گیا۔

"اچھا یہ تو فرمایئے کہ آپ نے مسٹر علی کو دو ہزار پگڑی کی رقم بھی واپس کر دی؟"

اس سوال نے مسٹر فریرا کے حواس باختہ کر دیئے۔ ٹیلیفون کا سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ بہت گھبراہٹ میں بدقت یہ الفاظ نکل سکے۔

"کیا مطلب......... دو ہزار......... پگڑی...... یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں"۔ جواب ملا۔ "مسٹر فریدا اصل واقعہ یہ ہے۔ کہ میں مس نرگس نہیں۔ مسز رحمان ہوں۔ ہم دونوں فلم میں ایکٹر ہیں۔ ہمیں مکان کی اشد ضرورت تھی اور جب آپ کے مکان کی اطلاع ملی تو یہ سارا ڈرامہ صرف اس واسطے کھیلا گیا۔ کہ بغیر پگڑی کے مکان حاصل کیا جا سکے بہرحال جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب آپ خاموش ہو کر بیٹھ جائیے۔ کیونکہ باقاعدہ پیشگی کرایہ کی رسید ہمارے پاس ہے اور ہم آپ کے وفادار کرایہ دار ہیں"۔

* * * * * *

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

* * * * * *

ڈرامہ

خطرے کی گھنٹی

افراد:- نواب فریدوں جاہ
زینت جہاں (بیگم فریدوں جاہ)
گمانی خانم (مغلانی)
گلشن (لونڈی)

مقام:- محسرا نواب فریدوں جاہ
وقت:- ۱۲ بجے شب

ہوائی حملہ کا الارم بجتا ہے۔

نواب صاحب۔ (سراسیمگی کے عالم میں بیگم صاحبہ کے کمرے پر دستک دیتے ہیں) بیگم صاحبہ۔ بیگم صاحبہ، آپ بیدار ہو گئیں۔

بیگم صاحبہ۔ جی ہاں۔ میں جاگ گئی ہوں۔ شب خوابی کے کپڑے تبدیل کر لوں۔ تو باہر آتی ہوں۔ (مغلانی کو آواز دیتی ہیں) گمانی خانم۔ گمانی خانم

گمانی خانم۔ (دوسرے کمرے سے جواب دیتی ہیں) جی بیگم صاحبہ۔ حاضر ہوئی۔

بیگم صاحبہ۔ (لونڈی کو بلاتی ہیں۔) گلشن۔ گلشن۔ اری او گلشن۔ (آپ ہی آپ) اس مُردار سے تو ناک میں دم ہے۔ بدنصیب جب سوتی ہے۔

گھوڑے بیچ کر سوتی ہے۔

گلشن ۔(دوڑتی ہوئی آتی ہے) جی بیگم صاحبہ حاضر ہوئی ۔ (ہانپتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے)

بیگم صاحبہ ۔ جھاڑو ماروں تیری صورت پر کیا سانپ سونگھ گیا تھا ۔ غدٹ جھونٹے نہ بلوائیے ۔ میں نے ہزاروں آوازیں دیں ۔ اور موئی ٹس سے مس نہ ہوئی ۔

گلشن ۔ (گڑگڑاتے ہوئے) حضور معافی چاہتی ہوں ۔ ابھی سوئی تھی ۔ ذرا غافل ہو گئی ۔

بیگم صاحبہ ۔ معافی کی خالہ ۔ ابھی تک کیا محلسرا کا پہرہ دے رہی تھی ۔ گمانی اس کے دو تھپڑ لگا ۔ حرام خود کان پکڑ کر اٹھ بیٹھ ۔

(تھپڑوں کی اور اٹھنے بیٹھنے میں ہانپنے کی آواز)

بیگم صاحبہ ۔ نامراد ۔ کسرت ہی کئے جائیگی یا کچھ کام بھی کرے گی ۔

گلشن ۔ جی ارشاد ۔

بیگم صاحبہ ۔ ارشاد کی بچی ۔ ڈیوڑھی پر جا کر پہرے والے سے کہہ کہ فنس فوراً ڈیوڑھی میں لگا دی جائے ۔ اور واپس آکر ہاتھ منہ دھونے کا سامان ٹھیک کر ۔

وقفہ

بیگم صاحبہ ۔ گمانی خانم کیا آپ نے کپڑے نکالے ۔

گمانی خانم ۔ جی حضور ۔ لباس حاضر ہے ۔

بیگم صاحبہ ۔ ذرا دیکھوں تو سہی کونسا جوڑا نکالا ہے ۔ اوئی نوج ۔ خانم معلوم

ہوتا ہے۔ اب تم بالکل سٹھیا گئی ہو۔ بھلا یہ وقت ساری اور جمپر پہننے کا ہے۔ نہیں معلوم تمہیں کب عقل آئے گی۔ ارے یہ چیز تو سیر و تفریح کے موقع پر پہننے کی ہوتی ہے۔ غضب خدا کا ایک زمانہ یہی کام کرتے ہو گیا۔ وہ اب تک یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کونسا لباس کس وقت پہنا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بال آپ نے دھوپ ہی میں سفید کئے ہیں۔

نواب صاحب۔ (دوبارہ دستک دیتے ہیں) بیگم صاحبہ کیا آپ نے لباس تبدیل فرما لیا۔ میں آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ ذرا عجلت کیجئے۔

بیگم صاحبہ۔ (جھنجھلا کر جواب دیتی ہیں) آپ کی عجلت نے تو زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ جب دیکھئے عجلت۔ جس کام میں دیکھئے عجلت۔ کھانے میں عجلت پینے میں عجلت۔ آنے میں عجلت۔ جانے میں عجلت۔ آپ کا کوئی کام بغیر عجلت کے ہوتا ہی نہیں۔ خدا اور رسول تک نے عجلت سے منع کیا ہے۔

نواب صاحب۔ بیگم صاحبہ جب کام ہی عجلت کا ہو تو کیا کیا جائے۔ میں نے تو آپ کو خطرے کا اشتہار بخوبی سمجھا دیا تھا۔ جس میں سختی سے تاکید ہے۔ کہ خطرے کا الارم بجتے ہی پانچ منٹ کے اندر مکان چھوڑ کر خندق میں پہنچ جانا چاہیئے۔

بیگم صاحبہ۔ اشتہار لکھنے والے نگوڑوں کی بھلی چلائی۔ قلم ہاتھ میں لے کر جو الٹا سیدھا جی میں آیا۔ لکھ ڈالا۔ ان کی بلا سے کوئی خندق میں جلے یا جہنم میں۔

نواب صاحب۔ لیکن بیگم صاحبہ۔ وہ غریب اپنی طبیعت سے تھوڑا ہی لکھتے ہیں حکومت سے جو حکم ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

بیگم صاحبہ۔ اور حکومت والے تو شاید انسان ہی نہیں ہوتے۔ اللہ میاں نے فرشتوں کو دنیا میں بھیج دیا ہے۔ نواب صاحب وہ حکومت والے ہوں یا اشتہار لکھنے والے۔ آپ اگر ان کے حکم کو خدا اور رسولؐ کا فرمان سمجھتے ہیں تو آپ کو مبارک رہے۔ میں ایسا حکم نہیں مان سکتی۔ کیا میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اللہ بخشے والد مرحوم کو۔ ان کے نام سے بڑے بڑے کانپتے تھے۔ کوتوال سے بڑا کون ہوگا۔ وہ بھی صبح و شام حاضری دیتا تھا۔ اور جب تک بیٹھنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ ٹوپی ہاتھ میں لئے ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا رہتا تھا۔ لیکن آپ کے یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔

نواب صاحب۔ بجا ارشاد ہوا۔ ماموں جان کے زمانے کا کیا کہنا۔ لیکن بیگم صاحبہ اب وہ بات کہاں۔

(سرد آہ بھرتے ہوئے)

جن کے محلوں میں ہزاروں رنگ کے فانوس تھے۔ جھاڑ اُن کی قبر پر ہیں۔ اور نشان کچھ بھی نہیں۔

بیگم صاحبہ۔ نوج۔ جھاڑ ہوں دشمنوں کی قبر پر۔ ماشاءاللہ آج بھی ابا جان کا مقبرہ خدا نظر بد سے بچائے تاج محل کو شرمندہ کر رہا ہے۔ روزمرہ صفائی کے واسطے ایک جاروب کش مستقل ملازم ہے۔

نواب صاحب - میرا منشا خدانخواستہ ماموں جان خُلد آشیاں کی فکر سے نہ تھا۔
آپ ناحق آزردہ خاطر ہوتی ہیں - یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔
مہربانی فرما کر ذرا عجلت فرمایئے۔

گلشن - بیگم صاحبہ۔ پہریدار کہتا ہے - کہ دو کہاروں کو آپ نے خود ایک
ہفتہ کی چھٹی دے دی ہے - فنس کا انتظام نہیں ہو سکتا۔

بیگم صاحبہ - خدا کی مار پہرے دار اور کہاروں پر - حرام خور سے کہو میں کیا اس
کے سر پر سوار ہو کر جاؤں گی۔

نواب صاحب - بیگم صاحبہ ناخوش ہونے کی ضرورت نہیں آپ موٹر پر تشریف
لے جا سکتی ہیں - خدا کے لئے تیار تو ہو جایئے۔

بیگم صاحبہ - لیکن آپ تو کہتے تھے کہ پٹرول بند ہو گیا ہے - کار بیکار ہو گئی۔

نواب صاحب - جانا ہی کتنی دور ہے - چند قدم کی مسافت کے لئے پٹرول
موجود ہے۔

بیگم صاحبہ - موٹر کی سواری بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے - لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔
موٹر منگوایئے میں اتنی دیر میں تیار ہوئی جاتی ہوں۔
(مغلانی سے مخاطب ہو کر) دوسرا جوڑا نکالا - دیکھوں تو۔
(جوڑا دیکھ کر) خدا کی سنوار ہو مغلانی تم پر - کیا آپ کو سوجھائی
نہیں دیتا - گھٹنا پاجامہ - لچکا پٹھا ٹنکا ہوا کرتہ - اور بیل لگا ہوا
دوپٹہ تو آج کل دھنے جلاہوں کی عورتیں پہنتی ہیں - کہاں تک
سر کھپاؤں۔ کیسے سمجھاؤں - جی میں آتا ہے۔ کچھ کھا کر سو رہوں۔

کہ تم لوگوں سے نجات مل جائے۔

مغلانی۔ بیگم صاحبہ گستاخی معاف۔ آپ کی پسند ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ ساڑی نکالی وہ ناپسند۔ گھٹنا نکالا وہ نامنظور۔ اب آپ خود جو فرمائیں نکال دوں۔ اس میں ناراض ہونے کی کونسی بات ہے۔

بیگم صاحبہ۔ کیا خوب ناراض ہونے کی کوئی بات ہی نہیں۔ نواب صاحب کی عجلت سے ہاتھ پاؤں پھولے جارہے ہیں۔ حکومت کا حکم آفتِ ناگہانی کی طرح سر پر مسلط ہے۔ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اور آپ فرماتی ہیں ناراض ہونے کی کونسی بات ہے۔ واہ بی مغلانی واہ۔

مغلانی۔ اچھا میں ہی قصوروار سہی۔ اب آپ جو ارشاد فرمائیں وہ جوڑا حاضر کیا جائے۔

بیگم صاحبہ۔ جب میں ہی ہر بات اپنی زبان سے کہوں تو آپ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں خود ہی ہر کام کر لوں گی۔

مغلانی۔ پھر آپ ہی فرمایئے میں کیا کروں۔ جو کچھ اپنی طبیعت سے کروں وہ آپ کو پسند نہیں۔ آپ خود اپنی پسند بتانا نہیں چاہتیں۔ غیب کا علم صرف اللہ میاں کو ہے۔ پھر آپ کی طبیعت کا حال کیسے معلوم ہو۔

بیگم صاحبہ۔ کان کھول کر سُن لو مغلانی۔ میں سب باتوں کو برداشت کر سکتی ہوں۔ لیکن نوکروں کی گستاخی کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔

اماں جان کی روح نہ شرمائے میں نے تمہارا بہت لحاظ کیا کہ تم ان کے وقت کی ملازم ہو۔ مگر اب تمہارا نباہ مشکل نظر آتا ہے غضب خدا کا پاؤں کی جوتی سر چڑھے۔ قیامت آجائے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ آخر یہ کیا انداز ہے برابر زبان لڑائے جا رہی ہو۔

مغلانی۔ آپ تو ناحق ناراض ہو رہی ہیں۔ میں نے کون سی گستاخی کی ہے یہی تو پوچھا ہے کہ آپ جو جوڑا کہیں نکال لایا جائے۔ (رونی آواز سے) میرا آب و دانہ تو اس محل سے اسی وقت اٹھ گیا جب بڑی بیگم صاحبہ نے دنیا سے کوچ کیا۔ اور جنت کی بی بی ہوئیں۔ خدا جانتا ہے۔ نو برس کی آئی تھی بچپنا۔ جوانی سبھی کچھ گزارا۔ مگر اللہ بخشے بڑی بیگم صاحبہ نے کبھی آدھی بات نہیں کہی۔ اب آپ لوگوں کا زمانہ ہے رکھیے یا نکال دیجئے۔

گلشن۔ بی گمانی میری مانو۔ کلی دار فرشی پائجامہ کارچوبی والا شلوکہ اور بنارسی دوپٹہ نکالو۔ خدا نظر بد سے بچائے ماشاء اللہ جب بیگم صاحبہ یہ جوڑا پہن لیتی ہیں۔ تو آسمان کی حور یا قاف کی پری معلوم ہوتی ہیں۔

بیگم صاحبہ۔ اب کہو مغلانی۔ اس وقت تو اس چھوکری نے تمہارے کان کاٹ لئے۔ میرے دل کی بات کہہ دی۔ ایمان سے کہو کیا میں نے اس سے کہہ دیا تھا۔ یا اسے علم غیب تھا۔ اب کھڑی کیا کر رہی ہو۔ جاؤ جلدی کرو۔ گلشن پانی وغیرہ تیار کر دیا۔

گلشن ۔ جی۔ سب سامان چوکی پر موجود ہے۔

نواب صاحب۔ کہیئے بیگم صاحبہ آپ تیار ہو گئیں۔ موٹر تیار ہے۔

بیگم صاحبہ۔ ہائے اللہ۔ میری تو غضب میں جان ہے۔ منلائی سے پیچھا چھوٹا۔ تو آپ نازل ہو گئے۔ کہہ دیا کہ تیار ہو رہی ہوں منہ ہاتھ دھونے جاتی ہوں۔ لیکن آپ ہیں کہ ہتھیلی پر سرسوں جما رہے ہیں۔

نواب صاحب۔ عجیب مصیبت ہے۔ ذرا غور تو فرمایئے کس قدر تاخیر ہو چکی ہے۔ اور ہنوز آپ تیار نہیں ہوئیں۔ اگر حکام شہر کو علم ہو گیا۔ تو فرمایئے کیسی رسوائی ہوگی۔

بیگم صاحبہ۔ کیا حکام شہر یہ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔ کیا انہوں نے خدانخواستہ مجھے کوئی دھنا جلاہا سمجھا ہے۔ کیسے اندھیر کی بات ہے نہ منہ ہاتھ دھو نہ کپڑے بدلو۔ بس خطرے کی گھنٹی بجتے ہی سر جھاڑ منہ پہاڑ گنواروں کی طرح اُلٹے سیدھے خندق میں چلے جاؤ۔ واہ صاحب واہ الیا نزالا حکم تو میں نے آج ہی سُنا۔ خدا غارت کرے اس لڑائی کو۔ نوج کالا منہ۔ میرے تو باوا دادا نے بھی ایسی لڑائی نہ دیکھی نہ سُنی۔ میں پوچھتی ہوں۔ کیا پہلے زمانے میں لڑائیاں نہیں ہوتی تھیں۔ یہی ہوتا تھا کہ فوجیں کسی میدان میں چلی گئیں۔ خوب لڑیں۔ کٹی مریں۔ ایک ہار گیا۔ ایک جیت گیا۔ چلو قصہ ختم۔ بستی والوں کو کانوں کان خبر

بھی نہ ہوتی تھی۔ جب سکہ بدلتا تھا تو پتہ چلتا تھا کہ فلاں کی بادشاہت چلی گئی۔ اور فلاں کی آگئی۔ تو بیوی اب نیا دستور نکلا ہے۔ فوجوں کو چھوڑ چھاڑ اب ساری آفت شہر والوں پر توڑی جاتی ہے۔ سچ پوچھو تو تاش۔ گنجیفہ۔ شطرنج۔ چوسر سر بگھی پچیسی۔ کنکوا۔ بٹیر بازی۔ مرغے اور مینڈھے لڑانا۔ یہ چیزیں بھی ایک قسم کی جنگ ہی ہیں۔ اللہ بخشے ابا جان گنجیفہ۔ اور سر بگھی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ خدا رکھے بڑے ماموں جان بٹیریں لڑانے میں ولایت تک مشہور ہیں۔ ماشاء اللہ بھائی جان کا ہر کنکوا نوشیرواں ہو کر اترتا ہے۔ لیکن میں نے تو آج تک نہ دیکھا۔ کہ اس قسم کی لڑائیوں میں دوسرے تو سہے الگ گھر والوں پر کوئی مصیبت ٹوٹتی ہو۔

نواب صاحب۔ معاذ اللہ۔ آپ نے تو اچھی خاصی ہوشربا تقریر شروع کر دی۔ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ کہ دور حاضرہ میں لڑائیاں کس طرح لڑی جاتی ہیں۔ انگریزی زبان سے آپ واقف نہیں۔ اخبار بینی کو آپ تضیع اوقات سمجھتی ہیں۔ آپ کو کیا علم ہو سکتا ہے۔ کہ آج کل سائنس نے کس قدر ترقی کی ہے۔ اور کیسی کیسی ایجادیں ہو گئی ہیں۔

بیگم صاحبہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں جاہل ہوں۔ نہ کچھ پڑھ سکتی ہوں نہ سمجھ سکتی ہوں۔ اماں باوا نے جو مولوی ابن علی کو رکھکر برسوں

بغدادی قاعدہ۔ کلام پاک۔ خالق باری گلستان اور بوستان پڑھوائی۔ وہ سب بیکار تھا۔ اللہ بخشے مولوی صاحب کو پارہ عم پورا حفظ تھا۔ ہزاروں شعر یاد تھے۔ ایسے قابل تھے کہ بڑی سفارشوں سے چار روپیہ ماہوار اور کھانے پر ملازمت منظور کی تھی۔ بیچارے ایسے آئے کہ مر کر ہی گھر سے نکلے۔ کفن دفن سب ابا جان نے کیا۔ تم ہی بتلاؤ منغلانی کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ تمہارے تو سامنے کی بات ہے۔ اب ہم جاہل ہیں۔ نگوڑی انگریزی نہ ہوئی۔ پیر جی کی چوٹی ہو گئی۔ کہ بغیر اس کے دنیا کا کوئی کام ہی نہیں ہو سکتا۔ قرآن درمیان۔ چھوٹے بھائی کو ایک وا کالا کرسٹان پڑھانے تو آتا تھا۔ سی۔ ٹی۔ یوں۔ چوہا آیا۔ مرغی گئی۔ جانے کیا کیا واہی تباہی بکا کرتا تھا۔ کبھی جا کر کھڑی ہو گئی۔ تو اللہ جانتا ہے ایک لفظ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

نواب صاحب۔ لاحول ولا قوۃ۔ پھر آپ نے وہی جھک شروع کر دی۔ میں نے یہ کب کہا کہ خدانخواستہ آپ جاہل ہیں۔ ایک سیدھی سی بات کہی کہ انگریزی آپ جانتی نہیں۔ اخبار بینی کا شوق نہیں واقعات حاضرہ اور سائنس کے ایجادات کا علم کیسے ہو سکتا ہے۔

بیگم صاحبہ۔ واہ صاحب واہ۔ سبحان اللہ اور جاہل کیسے بنایا جاتا ہے اس کے کیا صاف یہ معنی نہ ہوئے کہ اگر کوئی انگریزی نہیں جانتا۔ اور اخبار نہیں پڑھتا۔ اُسے کچھ نہیں آتا۔ وہ اچھا خاصہ گنوار

کا لٹھا ہے۔

نواب صاحب ۔ آپ تو خواہ مخواہ بات میں بات نکال رہی ہیں۔ اچھا صاحب میں ہی قصور وار سہی۔ اب قصہ ختم کیجئے۔ اور تیاری میں عجلت کیجئے۔

بیگم صاحبہ ۔ لو۔ خوب یاد آیا۔ آپ نے استخارہ بھی کر لیا۔

نواب صاحب ۔ آپ تیار ہوں۔ میں استخارہ کر کے ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

بیگم صاحبہ ۔ ذرا سواری کے متعلق بھی استخارہ فرمائیے گا۔ چل گلشن منہ ہاتھ دُہلا۔ مغلانی جوڑا نکالا۔

مغلانی ۔ جی۔ حاضر ہے۔

بیگم صاحبہ ۔ لائیے دیکھوں تو۔ ہاں پائجامہ تو ٹھیک ہے۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اس پائجامہ کو دیکھتی ہوں تو اللہ بخشے اباجان کی صورت نظروں میں پھرنے لگتی ہے۔ کیوں مغلانی۔ تم کو تو یاد ہوگا۔ اماں جان کے رڑنے جھگڑنے پر اباجان نے پانچ درزی لگا کر راتوں رات اسے تیار کرایا تھا۔ ہاں شلوکہ بھی ٹھیک ہے۔ اللہ بخشے بڑی مغلانی بھی کتنی دستکار تھیں۔ ان کے ہاتھ کا یہ آخری کام تھا۔ شادی کے بعد بیچاری ایسا پڑیں۔ کہ پھر نہ اٹھ سکیں۔ بی مغلانی۔ بھائی تم دوپٹہ میں چوک گئیں۔ اس پائجامہ کے ساتھ یہ بالکل بے جوڑ ہے۔

مغلانی ۔ حضور دوسرا نکلنے کو نکال دوں۔ مگر اس سے کوئی بھاری نہیں ہے۔ سب اس سے ہلکے کام کے ہیں۔

بیگم صاحبہ۔ کیوں۔ وہ دوپٹہ جس کا کپڑا برج لال بزاز کے یہاں سے آیا تھا گیا
وہ کم بھاری ہے۔
مغلانی۔ جی۔ وہ اس سے کہیں ہلکا ہے۔ کہئے تو لے آؤں۔ اس کی مقیش
لچکا۔ کامدانی۔ سب اس سے ہلکے ہیں۔
بیگم صاحبہ۔ میں کیسے کہوں کہ وہ ہلکا ہے۔ اچھا ذرا لاؤ تو سہی۔ (مغلانی
چلی جاتی ہیں۔ بیگم صاحبہ گلشن سے مخاطب ہوتی ہیں) گلشن
تجھ کو تو یاد نہ ہوگا۔ میرے خیال میں وہ دوپٹہ بھاری نہیں۔ تو
اس کے برابر ضرور بیٹھے گا۔ اما جان نے خاص اپنی پسند سے تیار
کرایا تھا۔
نواب صاحب۔ لیجئے استخارہ تو راست آگیا لیکن ابھی تک آپ کو کپڑوں
کے انتخاب سے ہی فرصت نہیں ملی۔ میں......... (یکایک
محل کی ڈیوڑھی سے پہریدار گلشن کو آواز دیتا ہے۔ گلشن بھاگتی
ہوئی باہر جاتی ہے)
بیگم صاحبہ۔ اور تو اور اس موئے پہریدار نے بھی عجلت شروع کر دی
نواب صاحب۔ لیکن آپ نے بھی غضب کیا۔ اتنی دیر ہوگئی اور آپ تیار نہیں
ہوئیں۔

(گلشن سراسیمہ و بدحواس آتی ہے)

گلشن۔ حضور غضب ہوگیا۔ پہرے دار کہہ رہا ہے کہ دو نیو آدمی ٹوپ
پہنے باہر کھڑے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ محل کے اندر روشنی کیوں

ہو رہی ہے۔ اور ابھی تک محل کے آدمی خندق میں کیوں نہیں گئے۔
وہ لوگ نواب صاحب کو بُلا رہے ہیں۔

نواب صاحب۔ (بھنچی ہوئی آواز سے) کمبخت۔ کیا تو نے کہہ دیا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ اس پہرے دار نے ان لوگوں سے کیا کہا۔

گلشن۔ حضور مجھے خبر نہیں کہ پہرے دار نے کیا کہا۔ میں نے تو کہہ دیا کہ میں اطلاع کرنے جاتی ہوں۔

نواب صاحب۔ اچھا تو جا کر کہہ دے کہ نواب صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ باہر نہیں آسکتے۔ پہرے دار سے کہنا کہ کسی طرح سے اس آفت کو ٹال دے۔ کل اس کو انعام دیا جائے گا۔

(گلشن جاتی ہے)

بیگم۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ ورنہ کسی کی مجال تھی کہ اس قسم کے اعتراضات کرتا۔

بیگم صاحبہ۔ اور میں کہتی ہوں کہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ اگر آج کو آپ نے ان لوگوں کو سر پہ نہ چڑھایا ہوتا تو کسی کو محلسرا کی طرف رُخ کرنے کی جرأت بھی نہ ہوتی۔ اللہ بخشے ابا جان کو

....

نواب صاحب۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) آپ کو تو سوائے ابا جان کے اور کوئی سبق ہی یاد نہیں رہا۔ جب دیکھئے ابا جان۔ جس بات میں سنئے ابا جان۔ کوئی تذکرہ۔ کوئی واقعہ بغیر ابا جان کے نام کے مکمل

ہی نہیں ہوتا۔ سنتے سنتے دماغ پراگندہ ہو گیا۔

بیگم صاحبہ ۔ واہ یہ اچھی رہی۔ تو صاحب اب کوئی اپنے بڑے بوڑھوں کا نام نہ لے۔

(گلشن دوڑتی ہوئی آتی ہے)

گلشن ۔ حضور پہرے دار کہتا ہے۔ کہ جب اس نے آپ کی ناسازی طبیعت کا عذر کیا تو وہ لوگ بہت بگڑے۔ کہا۔ ہم محلسرا کے اندر آکر نواب صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ واقعی بیمار ہیں یا بہانہ ہے۔ اُس پر میں نے کہا۔ خدانخواستہ آپ کی طبیعت بہت خراب ہے اور بیگم صاحبہ کے کمرے میں آرام فرما رہے ہیں۔ اس وقت نہیں مل سکتے۔

نواب صاحب ۔ استغفر اللہ۔ ارے کم بخت کیا تُو نے ان لوگوں کے سامنے بھی خدا نخواستہ کا جملہ کہا تھا۔

گلشن ۔ جی نہیں حضور۔ میرے کہنے ہی پر تو یہ آفت ٹلی۔ معلوم ہوا یہ کہکر چلے گئے۔ کہ خیر آج مشقی کارروائی تھی۔ لیکن آئندہ ایسا ہوا تو اچھا نہ ہوگا۔ اور محلسرا کے تمام لوگوں کا چالان کر دیا جائے گا۔

نواب صاحب ۔ الحمد اللہ۔

بیگم صاحبہ ۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ انشاء اللہ سویرے ہی مولا علی کی نذر دوں گی۔

مغلانی ۔ نیت شب بخیر۔ کل میں بھی بچوں کو ریوڑیاں بانٹوں گی۔

گلشن ۔ اور میں اگر خدا نے چاہا تو نواب صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں سے انعام لوں گی

تصویر کا تیسرا رُخ

افراد :- عمر۔ (تازہ ولایت بیرسٹر)
افضل۔ (عمر کے دوست)
نادر۔ (عمر کے والد)
زینت۔ (عمر کی والدہ)
حیدر۔ (عمر کے ہونیوالے خسر)
بلقیس۔ (عمر کی ہونیوالی ساس)
برجیس۔ (عمر کی ہونیوالی بیوی)

مقامات :- (۱) عمر کا آبائی مکان
(۲) عمر کی ہونے والی سُسرال

× × ×

(عمر اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہیں۔ ان کے دوست افضل آتے ہیں)

افضل۔ السلام وعلیکم۔ کہو یار کیا سوچ رہے ہو۔

عمر۔ ہندوستانیوں کی حماقت اور جہالت پر غور کر رہا ہوں۔

افضل - خیر تو ہے - کیا بیرسٹری چھوڑ کر لیڈری کرنے کا ارادہ ہے۔
عمر - ایسے احمقوں کی لیڈری کرنا بھی حماقت ہے - یہ ارادہ تو کوئی احمق ہی کر سکتا ہے۔
افضل - پھر ایسی بات پر غور کرنے سے حاصل - میرے نزدیک تو یہ بھی حماقت ہے۔
عمر - مصیبت یہ ہے کہ مجھے بھی حماقت میں مبتلا کرنے کے لئے گھسیٹا جا رہا ہے۔
افضل - یہ کیسے۔
عمر - یہ ایسے کہ میری شادی ہو رہی ہے۔
افضل - کہاں۔
عمر - حیدر کی صاحبزادی برجیس سے۔
افضل - وہی برجیس جس نے اسی سال بی - اے کیا ہے۔
عمر - جی ہاں - وہی۔
افضل - پھر اس میں اعتراض کی بات کیا ہے - لڑکی قابل ہے - حسین ہے - کمسن ہے - سسرال نہایت متمول اور ذی عزت اور کیا چاہیئے۔
عمر - ہو نہ آخر ہندوستانی - لگے وہی حماقت کی باتیں بگھارنے۔
افضل - جب ماں باپ ہندوستانی ہیں تو میں انگریز نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں - کہ آپ ایسے صاحب بہادر

کو اس شادی پر اعتراض کیا ہے۔

عمر۔ ایک اعتراض ہو تو بتاؤں۔

افضل۔ کیا ان کی تعداد سینکڑوں تک ہے۔

عمر۔ بیشک۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

افضل۔ اچھا۔ سر دست دو چار بتا دیجئے۔ باقی پھر کسی فرصت کے وقت بتا دیجئے گا۔

عمر۔ یہ حماقت نہیں۔ تو اور کیا ہے۔ میاں بیوی نے نہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ نہ مزاج اور طبیعت کا اندازہ کیا۔ نہ سلیقہ اور تہذیب کا جائزہ لیا۔ مگر اس کے باوجود دونوں میاں بیوی بنائے جا رہے ہیں۔

افضل۔ یہ کہئے۔ آپ کورٹ شپ کرنا چاہتے ہیں۔ بیشک انسان ٹکے کی ہانڈی بھی ٹھونک بجا کر لیتا ہے۔ نہ کہ اتنی لمبی چوڑی بیوی۔

عمر۔ (کسی قدر بگڑ کر) افضل۔ ہر وقت۔ اور ہر بات میں مذاق اچھا نہیں ہوتا۔ یہ میری آئندہ زندگی کا معاملہ ہے۔ میں اب بچہ اور ناتجربہ کار نہیں ہوں۔ دنیا دیکھی ہے۔

افضل۔ اس حقیقت کا علم آج ہوا کہ ساری دنیا سمٹ کر لندن کے عجائب خانہ میں رکھدی گئی ہے۔

عمر۔ پھر وہی مذاق۔ میں کہتا ہوں یہ مسئلہ میری آئندہ زندگی کو خوشگوار یا سوگوار بنانے والا ہے۔ میں ایسی شادی کر کے حماقت نہیں کر سکتا۔

افضل۔ گستاخی معاف۔ یہ حماقت تو آپ کے باپ دادا بھی کر چکے ہیں۔

عمر۔ آنکھ بند کر کے باپ دادا کے نقش قدم پر چلنا فرض نہیں۔

افضل۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔کیا واقعی کورٹ شپ کا ارادہ ہے۔

عمر۔ میرے نزدیک کورٹ شپ کوئی بُری چیز نہیں۔لیکن یہ نہیں تو کم از کم ایک دوسرے کو دیکھنا نہایت ضروری ہے۔

افضل۔ دوسرے لفظوں میں آپ کو ماں باپ۔اعزا۔اور احباب کے انتخاب پر اعتماد نہیں۔خود دیکھ کر اطمینان کرنا چاہتے ہو۔

عمر۔ یقیناً۔یہ فیصلہ میں والدہ کو بھی سُنا چکا ہوں۔

افضل۔شاباش۔سعادت مند لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

عمر۔ سبحان اللہ۔جو شخص ایمانداری کی بات کہے۔وہ آپ کے نزدیک غیر سعادت مند ہے۔بر ایں عقل و دانش بباید گریست۔

افضل۔جی نہیں۔یہی عین سعادت مندی ہے۔پہلے تو لوگ دہلی میں برسوں بھاڑ جھونک کر اس قسم کی حماقت سیکھا کرتے تھے۔لیکن اب یہ تعلیمی ادارہ لندن میں منتقل ہو گیا ہے۔جہاں آپ کے ایسے طالبعلم بھاڑ بھی جھونکتے ہیں۔اور گھاس بھی کھاتے ہیں۔

عمر۔ آپ کی بلا سے۔جائیے میں احمق ہی سہی۔

افضل۔کیا اس میں شبہ بھی ہے۔احمقوں کے دم تو لگی نہیں رہتی۔میں سمجھتا تھا کہ تم ولایت میں رہنے کے بعد انسان ہو گئے ہو گے۔مگر آج پتہ چلا کہ

خرِ عیسےٰ اگر بہ مکّہ رود
جو بیاید ہنوز خر باشد

(کرسی سے اٹھ کر) خدا حافظ۔

(عمر کے والد اور والدہ، یعنی نادر اور زینت میں گفتگو ہوتی ہے)

نادر۔ کیوں عمر کی ماں۔ آج اُداس کیوں ہو۔

زینت۔ کیا بتاؤں میری تو عقل حیران ہے۔

نادر۔ آخر بات بھی تو معلوم ہو۔

زینت۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ موا عمر میرا منہ کالا کرائے گا۔

نادر۔ کیسے۔

زینت۔ کہتا ہے۔ میں بغیر بیوی کو دیکھے شادی نہ کروں گا۔

نادر۔ (قہقہہ لگا کر) بات تو معقول کہتا ہے۔ میں نے بیوقوفی سے تم کو بغیر دیکھے بیوی بنا لیا جس کا آج تک خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ کہو تو میں بھی دوسرا نکاح خوب دیکھ بھال کر کر لوں۔

زینت۔ تم کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے شوق سے ایک نہیں دس کر لو۔ ذرا سوچو تو سب باتیں طے ہو گئیں۔ دونوں طرف تیاری ہو گئی۔ تاریخ مقرر ہو گئی۔ اپنے پرائیوں کو خبر دے دی گئی۔ اب سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں۔ کیا نہ کروں۔

نادر۔ سچ پوچھو تو یہ سب تمہاری بے جا محبت کا نتیجہ ہے۔ اس بارے میں اس کے ولایت بھیجنے کا سخت مخالف تھا۔ لیکن اس نے تم کو آلو بنایا

اور تم نے مجھ کو۔ اب یہ انہیں باتوں کا نتیجہ ہے۔ بھگتو۔ میں نے تو اسی لئے تم جانتی ہو۔ اس ناشدنی سے بولنا تک بند کر دیا۔ صورت سے نفرت ہوگئی۔ بس چلے تو گولی مار دوں۔

زینت۔ کوئی مشورہ دینے سے رہے۔ اور لگے الٹا طعنہ دینے۔ دنیا میں سب مائیں اپنی اولاد سے محبّت کرتی ہیں۔

نادر۔ اولاد تو ماشاءاللہ خدیجہ بھی ہے۔ ایمان سے کہو۔ کیا اُس سے بھی اتنی ہی محبت ہے۔ جتنی اس انگریز کے بچے سے ہے۔

زینت۔ خدیجہ سے اگر محبّت نہ تھی تو کیا تم نے پال پوس کر اُسے ہتھنی بنا دیا۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ لڑکیاں اس زمانے میں جان کا عذاب ہوتی ہیں۔

نادر۔ اور اس محبّت کا زبردست ثبوت یہ ہے۔ کہ اپنے لاڈلے کو تو پڑھنے سے زیادہ آوارہ اور بد تمیز بنانے کے لئے لندن روانہ کر دیا اور غریب خدیجہ کو بی۔اے تک پڑھانے کے لئے بھی تم نے قیامت برپا کر دی۔

زینت۔ اسی کا نتیجہ تو ہے کہ ٹیڑھی مانگ نکالے۔ عینک لگائے۔ ساری باندھے مستانی بنی پھرتی ہے۔ جی میں آتا ہے کہ کسی دن چھاتی پر سوار ہو کر گلا گھونٹ دوں۔

نادر۔ اور آپ کا چہیتا جب کوٹ، پتلون ڈاٹے۔ ہیٹ لگائے اور سگرٹ منہ میں دبائے کھڑے ہو کر پیشاب کرتا ہے۔ تو میرا جی چاہتا

ہے۔ پیچھے سے فرولی پھونک دوں۔

زینت بھونک دونا۔ کون منع کرتا ہے۔ پھونک دو تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔

نادر۔ اطمینان رکھو جس دن تم خدیجہ کا گلا گھونٹو گی اسی دن میں عمر کے قرولی بھونک دوں گا۔

زینت۔ ہاں اور کیا تم سے یہی تو ہونا ہے۔ دنیا زمانے کے باپ اگر ایسا ہی کرنے لگیں۔ تو اولاد بیچاری کا ہے کو رہے۔

نادر۔ جی ہاں۔ اور دنیا زمانہ کی مائیں اگر آپ کی طرح اپنے لڑکوں کو باپ بنالیں تو اولاد اور والدین کا رشتہ ہی ختم ہو جائے۔

زینت۔ یا اللہ آخر میں نے کیا کیا۔ جو دن رات طعنہ دیتے ہو۔

نادر۔ کیا یہ کہ اگر تم نے اس کو سر پر چڑھا کر فرعون نہ بنایا ہوتا۔ تو آج اس کی مجال تھی کہ اس قسم کی بدتمیزی کرتا۔

زینت۔ کیا تم باپ ہو کر اُسے بہلا پھسلا کر سمجھا نہیں سکتے۔

نادر۔ سمجھا تو سکتا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اب وہ اپنے آپ کو بیٹا نہیں میرا باپ سمجھتا ہے۔ اس لئے اگر میں نے بہلانے پھسلانے کا ارادہ کیا تو وہ خود مجھے گود میں لے کر سمجھانے لگے گا۔

زینت۔ (روتی آواز سے) یا اللہ۔ عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہوں وہ موا اپنی ضد سے باز آتا دکھائی نہیں دیتا۔ تم سے پوچھتی ہوں تو مذاق اڑاتے یا طعنہ دیتے ہو۔ جی میں آتا ہے۔ کہ کچھ کھا

کرسو رہوں۔

نادر۔ خدا کے واسطے ایسا نہ کرو۔ میں تو خیر دیکھ بھال کے دوسری کرلوں گا۔ اگر تمہارے دو زبردست ارمان دل کے دل میں رہ جائیں گے ایک عمر کی شادی اور دوسرے خدیجہ کا گلا گھونٹنا۔

زینت۔ عمر جائے چولھے میں اور خدیجہ جائے بھاڑ میں۔

نادر۔ بڑی ہوشیار ہو۔ کوئی بات چالاکی سے خالی نہیں ہوتی۔ جانتی ہو کہ عمر اگر چولھے میں گیا تو ختم ہونے میں کافی دیر لگے گی۔ جبتک کہ ممکن ہے کوئی بچالے۔ لیکن غریب خدیجہ بھاڑ میں جلتے ہی ٹھنڈا ہوجائے گی۔

×——×——×

(عمر کے ہونے والے خسر حیدر اور خوشدامن بلقیس میں گفتگو ہوتی ہے)

حیدر۔ بلقیس کی ماں تمہاری سمدھن کیسے آئی تھیں بہت دیر گفتگو رہی کیا معاملہ تھا۔

بلقیس۔ معاملہ کیا۔ مقدر کا رونا ہے۔ سچ ہے لڑکیاں ہوتے ہی مرجائیں۔ تو اچھا ہے

حیدر۔ آخر اس کوسنے پیٹنے کا سبب۔

بلقیس۔ آپ کے ہونے والے داماد بلند اقبال فرماتے ہیں جب تک میں دولہن کو خود نہ دیکھ لوں گا۔ شادی نہیں کرسکتا۔

حیدر۔ پھر تم نے کیا کہا۔

بلقیس۔ میں کیا کہتی۔ نہ اقرار ہی کرتے بنتا ہے نہ انکار۔ اسی سے لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں لڑکیاں جان کا عذاب ہیں عذاب۔ اچھے لڑکوں کا اول تو اُوڑا پڑ گیا ہے۔ دوسرے اگر ملتے ہیں۔ تو ان کا یہ حال ہے۔

حیدر۔ میری رائے میں تو اس شرط کے مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔

بلقیس۔ اوئی نوج۔ تمہارے نزدیک کوئی حرج نہیں۔ تم نے اپنے نکاح میں بھی یہ شرط لگائی تھی۔ تمہارے اماں باوا کے یہاں بھی ایسا ہُوا تھا۔ اگر یہی حال ہے۔ تو پھر کچھ دنوں کو برجیس کو وہیں بھیج دو۔ اچھی طرح دیکھ بھال لی جائے۔

حیدر۔ تم تو خواہ مخواہ کی بک بک کرنے لگتی ہو۔ جب دنیا کے رسم و رواج آہستہ آہستہ بدل رہے ہیں۔ تو ہم کب تک لکیر کے فقیر بن کر زمانے کے ساتھ چل سکتے ہیں۔

بلقیس۔ میں کیا جانوں نگوڑی دنیا کیا سے کیا ہو رہی ہے۔

حیدر۔ تم نے تو شاید یہ بھی نہ دیکھا ہوگا کہ بات چیت طے ہو جانے کے بعد سسرال والوں کے فرشتے بھی لڑکی کو دیکھ سکتے ہوں۔ لڑکیاں بلی کے گو کی طرح چھپائی جاتی تھیں۔ مگر اب ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

بلقیس۔ خیر سسرال والوں کی بات جانے دو۔ مگر کہیں ایسا بھی آج تک ہُوا ہے کہ لڑکیاں دُولہا کو دکھائی جائیں۔

حیدر۔ سسرال والوں کی بات کیوں جانے دی جائے۔ یہ بھی تو پہلے نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح اس کو بھی سمجھ لو کہ تہذیب نے ایک قدم اور آگے

بڑھا دیا۔

بلقیس۔ لیکن اس بات کی اونچ نیچ کو بھی تو دیکھو۔ اللہ نہ کرے اگر اس نے بوجیہ کو دیکھ کر ناپسند کیا۔ تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں گی۔ پھر لڑکی کو کون پوچھے گا۔

حیدر۔ اونچ نیچ تو ہر بات میں ہے۔ تصویر کے دو ہی رُخ ہوتے ہیں پسند کرے گا یا ناپسند۔ بظاہر تو ہماری بوجیہ اگر ہزاروں سے نہیں تو سینکڑوں سے ضرور اچھی ہے۔ بہر حال ہمیں اپنے اور لڑکی کے مقدر پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

بلقیس۔ دیکھو اس چودہ صدی میں کیا کیا دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ اس لونڈے کو ولایت جا کر کیا ہو گیا۔ اس سے پہلے تو کس قدر سیدھا اور بھولا معلوم ہوتا تھا۔

حیدر۔ ان حرکتوں کی وجہ سے سُنا ہے اس کے باپ خود نالاں ہیں۔ بولنا چالنا تک ترک کر دیا ہے۔ لندن کی آب و ہوا نے اُس کا دماغ ہی بیکار کر دیا۔

بلقیس۔ جب یہ حال ہے۔ تو کیوں نہ ہم صاف انکار کر دیں۔ شمیم تو گھر ہی کا لڑکا اور سمجھا بوجھا ہے۔ پرسوں ہی بھابھی آئی تھیں۔ اور باتوں باتوں میں اشارہ کر رہی تھیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بھابجان کوئی بڑے آدمی نہیں کھاتا پیتا گھر ہے۔ شمیم ابھی دو سو ہی تنخواہ پاتا ہے۔ البتہ ترقی کی اُمید ہے۔

حیدر۔ نہیں۔ اب انکار کرنے میں ہماری زیادہ بدنامی ہوگی۔ شمیم اچھا لڑکا ضرور ہے۔ مگر اس قسم کا خیال بے سود ہے۔

×——×——×

(مسٹر عمر کی شرط کے بموجب برجبیں انہیں دکھا دی جاتی ہے۔ اور وہ پسند بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن عین اس موقع پر جب کہ مسٹر عمر برات لے کر حیدر صاحب کے مکان پہنچتے ہیں۔ انہیں ایک گمنام دستی خط ملتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ لڑکی دکھلانے میں انہیں دھوکا دیا گیا ہے۔ اس خط کا کسی سے تذکرہ نہ کرتے ہوئے انہیں صحیح دولہن کو دیکھنے پر اصرار کرنا چاہیئے۔ ورنہ کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ چنانچہ مسٹر عمر اسی ہدایت پر عمل فرماتے ہیں۔ مسٹر افضل مسٹر عمر کے دوست اس خدمت پر مامور کئے جاتے ہیں۔ جن کی حیدر صاحب سے گفتگو ہوتی ہے)

×——×——×

افضل۔ آپ کی زحمت کا شکریہ۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو ایک خاص بات آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حیدر۔ میاں اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ شوق سے کہو۔

افضل۔ ہمارے عمر صاحب کو دولہن کے معاملے میں پھر کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔

حیدر۔ کیسی غلط فہمی۔ ذرا صاف صاف کہو۔

افضل۔ وہ دولہن کو پھر دیکھنا چاہتے ہیں۔

حیدر۔ میاں افضل۔ اب تو پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کی بددماغی اب ناقابلِ برداشت ہے۔ غور تو کرو۔ لڑکی انہیں دکھلا دی گئی۔ ان کی ماں اور اُن کے یہاں کی دوسری عورتوں نے دیکھ لیا۔ پسندیدگی کا اظہار کر دیا گیا۔ بارات دروازے پر موجود ہے مہمانوں سے گھر بھرا ہوا ہے۔ اب وہ فرماتے ہیں کہ لڑکی پھر دکھلائی جائے۔ آخر یہ شادی ہے یا مسخرہ پن۔

افضل۔ جناب نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل درست ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ موقع کی نزاکت مجبور کر رہی ہے۔

حیدر۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ جو کچھ ہو چکا اس کی بھی کسی کو اطلاع ہے اور کسی کو نہیں۔ لیکن اب میں اُس سے زیادہ ذلت و رسوائی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

افضل۔ میں جناب سے مؤدبانہ عرض کروں گا۔ کہ اس سے زیادہ بارات کے اکھڑ جانے میں ذلت و رسوائی ہے۔

حیدر۔ آخر تم ہی تبلاؤ۔ ایسے موقع پر اس کا انتظام کیسے ممکن ہے۔

افضل۔ اس کی ترکیب بہت آسان ہے۔ باہر یہ ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ کہ دولہا کو کسی رسم کے لئے اندر بلایا جا رہا ہے۔ اندر آپ یہ فرما دیں کہ مہمانوں کی نشست کے انتظام کیوجہ سے تھوڑی دیر کے لئے دولہن کو دوسرے کمرے میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

حمید۔ بہتر ہے۔ میں دولہن کی ماں سے مشورہ کرتا ہوں۔

×———×———×

(یہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا ہے اور بلقیس اپنی لڑکی برجیس کو دوسرے کمرے میں لے جاتی ہیں۔ جہاں تنہائی میں ماں بیٹی میں گفتگو ہوتی ہے)

برجیس۔ اماں مجھے اس مردانہ کمرے میں کیوں لایا گیا۔

بلقیس۔ بیٹا۔ قسمت کے لکھے کو پورا کیا جا رہا ہے

برجیس۔ کچھ بتائیے تو سہی۔

بلقیس۔ میاں عمر کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ وہ پھر تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔

برجیس۔ ماں۔ اب میرا پیمانۂ ضبط و تحمل لبریز ہو چکا ہے۔ آخر یہ مذاق کب تک ہوگا۔

بلقیس۔ کیا کہوں۔ میری کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔

برجیس۔ اچھا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس موقع پر ان کے والدہ والد اور چند مخصوص لوگوں کو بھی بلا لیجئے۔ تاکہ پھر کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

(چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور مسٹر عمر کے علاوہ ان کے والدین اور دیگر مخصوص مرد اور عورتیں برجیس کے کمرے میں جمع ہوتے ہیں)

حمید۔ برجیس کوئی غیر شخص نہیں ہے۔ تم منہ کھول سکتی ہو۔

(برجیس نقاب اٹھا دیتی ہے عمر نزدیک آکر بغور دیکھتے ہیں)

برجیس۔ کہئے جناب کی غلط فہمی رفع ہو گئی۔ اب آپ کا کیا فیصلہ ہے۔

عمر۔ اب کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔ اور میں آپ کو اپنی شریک زندگی بنانے

میں نہ صرف خوش ہوں، بلکہ اسے قابلِ فخر سمجھتا ہوں۔

مہ جبیں۔ میں بے حد ممنون ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔ اور اس رشتہ کو اپنے لئے باعثِ ذلت سمجھتی ہوں۔

عمر۔ ہائیں، یہ کیا۔ معاملہ تو صرف میری منظوری یا نامنظوری کا تھا۔

مہ جبیں جی ہاں۔ تصویر کا یہ تیسرا رُخ ہے۔

عمر۔ لیکن آپ کو اس معاملہ میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔

مہ جبیں۔ کیوں۔

عمر۔ لڑکیاں اس مسئلہ میں خاموش رہتی ہیں۔

مہ جبیں۔ اس کا سبب۔

عمر۔ دستور یہی ہے۔

مہ جبیں۔ شادی سے قبل دلہن کو دس دس مرتبہ دیکھنا یہ کہاں کا دستور ہے۔

عمر۔ یہ اس واسطے کہ لڑکا ہر طرح اپنا اطمینان کر لے۔

مہ جبیں۔ اور یہ اس لئے کہ لڑکی کو آپ پہ کوئی اطمینان نہیں۔

عمر۔ بارات واپس لے جانے میں میری سخت توہین ہوگی۔

مہ جبیں۔ آپ کے ساتھ شادی کرنے میں میری سخت ذلّت ہوگی۔

عمر۔ میں توہین کا دعویٰ کر دوں گا۔

مہ جبیں۔ اور زیادہ توہین ہوگی۔

عمر۔ للٰہ۔ التماس کیجئے۔ بارات واپس لے جانے میں بڑی رسوائی ہوگی۔

مہ جبیں۔ کیا آپ نے میری اور میرے والدین کی اس رسوائی کا بھی اندازہ کیا تھا۔

کہ اگر آپ مجھے پسند نہ فرماتے اور بارات واپس لے جاتے۔

عمر۔ میں اپنے قصور کی معافی چاہتا ہوں۔

برجیس۔ میں قیامت تک معاف نہیں کر سکتی۔ یہ بھی آپ لوگوں کا ایک فریب ہے جس سے عورتیں اب بخوبی آگاہ ہو چکی ہیں۔

افضل۔ مسٹر عمر میرے خیال میں یہ سارا بحث مباحثہ بقول جناب کے ہندوستانیوں کی حماقت ہے۔ جس میں خواہ مخواہ آپ مبتلا ہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اس فیصلہ کی اطلاع بارات کو ہو چکی ہے اور سب واپس جا رہے ہیں۔ چلئے آپ بھی تشریف لے چلئے +

* * * * *

رانی پٹیالہ

"کورس گانے والیاں اور نومشق"

فرولیٹی تھیٹر کے ملازم لڑکے کی چیخ دار آواز ابھی اسٹیج کے گوشوں میں گونج ہی رہی تھی۔ کہ ڈانسنگ روم عکے ایکٹریسوں سے خالی ہو گیا۔ اور ڈرسنگ امر مر کے زینہ پر نوخیز اور نومشق لڑکیوں کی چائیں چائیں شروع ہو گئی۔ لیکن مس اسٹریکر نے ان خوش فعلیوں اور ہنسی مذاق میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ متانت اور سنجیدگی سے اس مجمع سے کسی قدر پیچھے دھیرے دھیرے اسٹیج کی طرف چل رہی تھی۔ زینہ کے نیچے تھیٹر کا مینجر بظاہر بڑی بے چینی سے کسی کا منتظر تھا۔ اور اس کو دیکھتے ہی اس نے رُکنے کا اشارہ کیا۔

"مس اسٹریکر آج تمہاری چھٹی ہے۔ اور تم جا سکتی ہو۔"

"میں اس چھٹی کا مطلب نہیں سمجھی۔" مس اسٹریکر نے متعجبانہ دریافت کیا۔

"خیر یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ ابھی تبدیل لباس کے لئے کافی وقت ہے۔ مسٹر کونٹ منتظر ہوں گے"۔

درحقیقت منیجر کو مس اسٹریکر کی درخواست صرف ایک گھنٹے کی ملی تھی جس کو ان حضرت نے نظرانداز کر دیا تھا۔ مگر اس رخصت کی اہمیت کا اس وقت اندازہ ہُوا۔ جبکہ مسٹر کونٹ نے فون پر سفارش کی اور بتلایا کہ وہ پٹیالہ ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لئے مس اسٹریکر کے منتظر ہیں۔ مسٹر کونٹ کی شخصیت منیجر صاحب کے واسطے ایک سرمایہ دار ہونے کے علاوہ اس لئے بھی بہت زیادہ تھی کہ وہ فریولیٹی تھیٹر کی مجلس منتظمہ کے ایک سربرآوردہ رکن تھے۔ مگر ساتھ ہی منیجر صاحب کے واسطے یہ انکشاف بھی انتہائی موجب حیرت تھا۔ کہ مسٹر کونٹ باوجود اپنی پیرانہ سالی کے اس قدر بلند ذوق رکھتے ہیں۔ کہ مس اسٹریکر ایسی نوخیز اور کمسن لڑکی کی گرمی صحبت میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

"لیکن ...... میں ہنوز فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھے جانا چاہیئے یا نہیں"۔ مس اسٹریکر نے تذبذب کے انداز میں کہا۔

"بے وقوفی نہ کرو بیلی۔ ایسے زریں مواقع زندگی میں کم ہاتھ آتے ہیں"۔ گفتگو کا موضوع بدلتے ہوتے" اور کہو تمہارے شاگرد راجہ صاحب پٹیالہ ناچ کی مشق میں کیسے جا رہے ہیں۔ تمہارے سکھانے سے مطمئن تو ہیں"۔

"جی ہاں"۔ بیلو اسٹریکر نے شرمگیں انداز میں کہا۔

"اچھے نہیں تو خراب بھی نہیں۔ خاصی دلچسپی لے رہے ہیں"۔

بیلی اسٹریکر نے جلد جلد منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کیا۔ اور تھیٹر سے باہر جاتے ہوئے کلرک سے دریافت کیا۔"

"میرا کوئی خط تو نہیں آیا۔"

"جی نہیں۔ البتہ وہی دو آدمی پھر آج شام کو آئے تھے۔ یہ پوچھتے تھے کہ آج آپ کام کر رہی ہیں۔ مگر میں نے کہدیا کہ آج آپ کی چھٹی ہے۔"

بیلی اسٹریکر سمجھ گئی کہ یہ دونوں آدمی ضرور وہی تھے۔ جنہوں نے اس سے پہلے بھی کئی بار اس پر سمن تعمیل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ بیلی اسٹریکر نے اپنے کروفر اتنے وسیع اور امیرانہ بنا رکھے تھے۔ کہ ان کا متحمل ہونا اس کی محدود اور قلیل آمدنی کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قرض کی مصیبت میں بُری طرح گرفتار ہو گئی۔ اور عدم ادائیگی کی وجہ سے بعض قرض دہندوں نے زنجیر عدالت ہلانا شروع کر دی۔

وہ تیز قدم چلتی ہوئی تھیٹر کے باہر آئی اور سب سے پہلی ٹیکسی جو دکھائی دی اس کے ڈرائیور کو جلد از جلد ہدایات دیکر اندر بیٹھ گئی۔ پانچ منٹ کے اندر اندر وہ پنیالہ ریسٹورنٹ میں مسٹر کوونٹ کے روبرو تھی جو ایک گوشہ میں تنہا بیٹھے اخبار پڑھنے میں مستغرق تھے۔ بیلی اسٹریکر کو دیکھتے ہی اُٹھکر گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میں اس تاخیر اور انتظار کی زحمت کی معافی چاہتی ہوں۔" اسٹریکر نے ملتجیانہ انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"پیاری بچی"، مسٹر کوونٹ ازراہ شفقت بولے۔

"میں اب ایسی عمر کو پہنچ گیا ہوں۔ جہاں انتظار اس وقت تک باعث تکلیف نہیں ہوتا جب تک شام کا اخبار ہاتھ میں ہے"۔

مس اسٹریچر مسٹر کوونٹ کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتی تھی۔ صرف دو مہینے ہوئے اس کا تعارف ہوا تھا اور اس قلیل مدت میں جو کچھ جان سکی۔ وہ صرف اس قدر تھا کہ مسٹر کوونٹ بڑے خوش اخلاق۔ بڑے سنجیدہ اور مخلص آدمی تھے۔ وہ کوونٹ براونز کے سنئیر پارٹنر اور بڑے متمول لوگوں میں سے تھے۔ باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ اور انداز گفتگو بے حد جاذب تھا۔ کھانے کے بعد مسٹر کوونٹ نے اطمینان سے کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"کہو۔ تم نے میری تجویز پر غور کرنے کے بعد کیا فیصلہ کیا"۔

"جی ہاں"۔ کسی قدر گھبراتے ہوئے لہجے میں مس اسٹریچر نے جواب دیا۔ "کافی غور کیا۔ اور مجھے افسوس ہے میں اسے منظور نہیں کر سکتی"۔

مسٹر کوونٹ کی پنتالیس سالہ عملی اور کاروباری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں ایسے نازک اور پیچیدہ مسئلہ سے سابقہ پڑا۔ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان کے لئے بالکل نیا تھا۔ تاہم وہ بڑے مستقل مزاج انسان تھے۔ اور ہزاروں اہم مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کر چکے تھے۔ اس لئے اسٹریچر کے بظاہر اس مایوسانہ جواب سے گھبرائے نہیں اور خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے بولے۔

"تم پھر غور کرو۔ البتہ کل صبح تک جواب ملنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ راجہ صاحب آئندہ ہفتہ میں ہندوستان واپس جا رہے ہیں"۔

"تین ہفتہ" اسٹریکر نے متعجب ہو کر سوال کیا۔

"میرا تو خیال تھا کہ وہ ابھی مہینوں قیام کریں گے"۔

"نہیں انہیں فوراً جانا ہے۔ بیلی۔ معاف کرنا۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے بلند معیار زندگی کی وجہ سے قرض کی مصیبت میں بری طرح گرفتار ہو۔ جس سے گلو خلاصی کی بظاہر کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی۔ اب سوچو کہ ایک آدمی جو بُری طرح تم پر فریفتہ ہے۔ نہ صرف تمہیں اس قرض کے عذاب سے چھڑا سکتا ہے بلکہ دنیا کا ہر بیش قیمت عیش و آرام تمہارے لئے مہیا کر سکتا ہے۔ مکان نہیں محل رہنے کو ملے گا۔ ملازمین کی ایک پوری فوج تمہاری غلام ہو گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ آدمی اپنے رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہے۔ مگر یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آج وہ لندن کی بہترین سوسائٹیوں کا ہر دلعزیز ممبر ہے۔ ان حالات میں تمہی بتلاؤ کہ تمہارا انکار اگر طفلانہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے"!

مس اسٹریکر نے کوئی جواب تو نہیں دیا۔ مگر اب بھی اس نے مذبذب انداز میں سر ہلا دیا۔

"مس مسٹریکر میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ تم یہاں بیٹھے ہوئے اس زندگی کا عشر عشیر بھی اندازہ نہیں کر سکتی ہو۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے جس عیش و نشاط کا نقشہ اور روح پرور نظارے دیکھے ہیں۔ وہ تمہیں خواب میں بھی نظر نہیں آ سکتے"!

"لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے یہ دلچسپ مہاراجے درجنوں

بیویاں رکھتے ہیں۔ پھر فرض کر لیجئے اگر مجھ سے بھی دل سیر ہو گیا۔ تو میرا کیا حشر ہو گا؟"

مسٹر کووِنٹ نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "خدانخواستہ ایسی صورت میں تمہارا معاملہ دوسروں سے مختلف ہو گا۔ چونکہ تم نسلاً انگریز ہو اس لئے تمہارے مخصوص حقوق ہوں گے۔ اور جن کو محفوظ رکھنے کی حکومت برطانیہ براہ راست ذمہ دار ہو گی۔"

"وہ کب تک اس کی تکمیل چاہتے ہیں" مس اسٹریکر نے دریافت کیا۔

"تمہارا مقصد ہے شادی کی تکمیل، اس کا تو آج ہی رات کو ہونا ضروری ہے۔"

"آج ہی....... رات کو؟" مس اسٹریکر نے متحیر ہو کر کہا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ہندوستان پہنچ کر اس کی تکمیل ہو؟"

"قطعی ممکن نہیں۔" مسٹر کووِنٹ نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ "قبل روانگی اس کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اور چونکہ یہ چیز بالکل سادے طور پر ہو گی۔ اس لئے تاخیر کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ کیوں۔ کیا تمہیں اس عجلت میں کوئی خاص اعتراض ہے۔"

"کوئی خاص اعتراض تو نہیں"۔ لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"البتہ...... میں..... اس لئے....."

"میں تمہارے اس پس و پیش کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے مسٹر کووِنٹ نے جیب سے نوٹ کیس نکالا اور دو نہایت دبیز بنڈل نوٹوں کے مس اسٹریکر کیطرف بڑھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"کیا یہ دنیا کا انتہائی حیرت ناک واقعہ نہیں کہ میں ساٹھ برس کا معزز اور مقدس آدمی اس وقت جب کہ مجھے بستر پر آرام کرنا چاہیئے تھا۔ ویسٹ اینڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا ایک ہندوستانی راجہ کے گٹھ بندھن کی جد وجہد کر رہا ہوں خیر چونکہ راجہ صاحب میرے فرم کے خاص گاہکوں میں ہیں اس لئے ان کی ہر خواہش میرے سر آنکھوں پر ہے۔ لو یہ دو ہزار پونڈ کے نوٹ ہیں"

میں اس کا مطلب نہیں سمجھی"۔ مس اسٹریکر نے حریصانہ نوٹوں کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"یہ میری جانب سے شادی کا تحفہ ہے۔ قصد تو یہ تھا کہ کوئی بیش قیمت زیور پیش کر دوں مگر پھر خیال آیا کہ تمہیں اس وقت نقد روپیہ کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"میں اس محبت اور خلوص کے لئے آپ کی بیحد ممنون ہوں"

دونوں آدمی مسٹر کوونٹ کی کار میں بیٹھ کر راجہ صاحب کی جائے قیام پر پہنچے جہاں راجہ صاحب ڈرائنگ روم میں ایک آرام کرسی پر نیم خواب حالت میں دراز تھے۔ مس اسٹریکر کو دیکھتے ہی باچھیں کھل گئیں۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر مسکراتے اور کسی قدر لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھے اور بیلی کو آغوش میں لیتے ہوئے بولے۔

"تم آگئیں"!

بظاہر راجہ صاحب کے یہ الفاظ بالکل معمولی اور صاف تھے اور نہایت سادگی سے ادا کئے گئے۔ لیکن بیلی اسٹریکر کے لئے ان میں ایک عجیب طلسم پوشیدہ تھا۔ سنتے ہی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ بڑی مکاری اور فریب کیا گیا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو راجہ صاحب کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے مسٹر کوونٹ سے

مخاطب ہو کر کہا۔

"مسٹر کووِنٹ میرے لئے یہ تمام باتیں ناقابلِ برداشت ہیں۔ میں اپنا فیصلہ واپس لینا چاہتی ہوں۔"

"کیوں حماقت کر رہی ہو بیلی" مسٹر کووِنٹ نے مس اسٹریکو کے برابر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

راجہ صاحب یہ تمام منظر بڑے سکون اور اطمینان سے دیکھتے ہوئے زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ یکایک انہوں نے تالی بجائی جس کے جواب میں ایک ہندوستانی ملازم کمرے کے دوسرے سرے پر نمودار ہوا۔ جس سے مخاطب ہو کر راجہ صاحب نے ایک نامانوس زبان میں جلد جلد چند الفاظ کہے۔ اور ملازم کے جانے کے بعد انگریزی میں بولے۔

"ابھی ابھی ایک مختصر سی رسم ادا کی جائے گی۔ اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

آدھ گھنٹے بعد مسٹر کووِنٹ بڑے اطمینان سے سگار پیتے ہوئے کار میں اپنے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ یکایک خود سے مخاطب ہو کر بولے۔

"خدا کا شکر ہے۔ یہ اہم مسئلہ بخیر و خوبی انجام پا گیا۔"

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کہ بیلی اسٹریکو ہندو رسم و رواج کے بموجب اب راجہ صاحب پٹیالہ کی باقاعدہ آٹھویں بیوی تھی۔ جس سے وہ ہنوز ناواقف تھی۔

گذشتہ واقعات کو دس سال ہو گئے۔ اور اس دوران میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہو چکے تھے۔ راجہ صاحب بھی چل بسے اور مسٹر کوونٹ نے بھی ہندوستان ہی میں اس دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ اب کوونٹ برادرز کے دو حصہ دار تھے۔ مارٹن کوونٹ۔ مسٹر کوونٹ کے صاحبزادے اور دوسرا مرحوم کا بھانجہ ٹام کمبرلے۔ جس کو یہ حصہ داری اپنے ماں کے ترکے میں ملی تھی۔ جو کم و بیش دو سو برس سے اس خاندانی فرم میں چلی آ رہی تھی۔ مارٹن بڑا حصہ دار تھا اور ٹام چھوٹا اور یہ فرق عمر اور شکل و صورت سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔

اس وقت دونوں حصہ دار مارٹن کوونٹ کے کمرے میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے فرم کے متعلق کسی اہم مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ ٹام کمبرٹ نے مارٹن کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"مارٹن، حالانکہ مجھے یہ کہتے ہوئے بُرا معلوم ہوتا ہے۔ مگر مجبور ہوں، مجھے تمہاری تجویز دیانتدارانہ نہیں معلوم ہوتی"

مارٹن کوونٹ نے ہنستے ہوئے بزرگانہ لہجے میں جواب دیا۔

"ٹام۔ تم ابھی بچے ہو۔ بنک کے کاروباری رموز تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتے"

"مجھے اپنی ناتجربہ کاری سے انکار نہیں۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے کے اندازہ کرنے میں میں کبھی غلطی نہیں کر سکتا"

"ٹام" قدرے سخت لہجہ میں "اگر تمہاری کاروباری زندگی کا یہی معیار ہے تو تمہیں کسی مذہبی جماعت میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ اور غالباً ہندوستان میں

میں اس کا کافی موقع ہے۔ میاں کاروباری دنیا میں ایمان داری اور بے ایمانی سبھی کچھ کرنا پڑتی ہے۔"

"میں عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ اس فرم میں میری موجودگی تمہیں ناگوار ہے۔ مگر کیا کروں کم و بیش دس ہزار پونڈ سالانہ کی رقم پر لات مارنا میرے بس کی بات نہیں۔ لیکن اس کے باوجود میری رائے زنی پر آخر تم چراغ پا کیوں ہو گئے۔ میرے خیال میں اوّل تو ہمارا فرم اس وقت نہایت مستحکم اور مضبوط ہے۔ توقعات سے زیادہ منافع ہو رہا ہے۔ ایسی سٹہ بازی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جس میں تباہ و برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دوسرے اپنے گاہکوں کا روپیہ بغیر ان کے علم اور منظوری کے ایسے کاروبار میں لگانا سراسر فریب اور بے ایمانی ہے۔"

"اگر تمہیں علم ہوتا کہ اب سے تقریباً دس سال پہلے اس فرم کی کیا کیفیت ہو چکی تھی۔ اور کس طرح اسے زندہ رکھا گیا۔ تو شاید تمہاری رائے آج کچھ اور ہوتی۔"

"کیا مطلب" ٹام نے متعجبانہ سوال کیا۔

"مطلب یہ ہے کہ دس سال ہوئے ہمارا فرم دیوالیہ ہونے کے قریب تھا مالی حالت تباہ ہو چکی تھی۔ لیکن اللہ بخشے والد مرحوم کو جنہوں نے کسی نہ کسی طرح راجہ پٹیالہ کو ممنون احسان بنا کر اُن کے روپیہ سے اس کو تباہی اور بربادی سے بچا لیا۔"

"یہ میرے لئے بالکل نئی چیز ہے۔ میں اس وقت اسکول میں تھا۔ ہاں یہ تو

بتاؤ کہ راجہ پٹیالہ کو ممنون بنانے والی کیا ترکیب تھی"۔

"میں بھی اس وقت اسکول میں تھا" مارٹن نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "ممنون بنانے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ہوا یہ کہ راجہ صاحب موصوف اوّل تو طبعاً بالکل کاٹھ کے اُلّو تھے۔ دوسرے جب وہ انگلینڈ آتے تو یہاں کی آب و ہوا نے شاید اس میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔ خیر یہ بھی کوئی بُری بات نہ تھی۔ مگر سونے پر سہاگہ جو ایکٹریس آپ کو ناچ سکھانے آتی تھی۔ آپ اس پر بے تحاشہ عاشق ہو گئے۔ خیر والد صاحب نے بڑی جد و جہد سے یہ مرحلہ سر کیا۔ اور اس خدمت کے صلے میں راجہ صاحب نے والد مرحوم کو اپنا مالی مختار بنا دیا"۔

"اچھا" ٹام نے متحیر ہو کر دریافت کیا۔ "تو موجودہ رانی پٹیالہ کیا وہی انگلش لیڈی ہے؟"

"بیشک۔ راجہ صاحب کے مرنے کے بعد وہ انگلینڈ واپس آ گئی۔ لیکن اگر اُسے کاروبار کے متعلق اصل واقعات کی اطلاع ہوتی تو وہ اپنا حساب ہمارے یہاں رکھنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتی"۔

ٹام نے ہلکی سی جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ واقعات سُن کر افسوس ہوا کاش یہ روپیہ کسی اور ذریعہ سے پیدا کیا گیا ہوتا"۔

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" مارٹن نے کسی قدر متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ "مگر واضح رہے کہ اس لڑکی کے روپیہ سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ والد مرحوم نے راجہ صاحب کو اُس معاملہ میں ممنون بنا

کہ ان کی نظروں میں اپنا اعتبار زیادہ قائم کر لیا۔"

ٹام نے طعنہ زنی کے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ عجیب بات ہے کہ راجہ صاحب نے مقابلتہً عسرت اور کم مائیگی کی حالت میں انتقال کیا۔ اور اسی اوسط سے رانی صاحبہ کے تمول میں اضافہ ہو گیا ہو سکتا ہے کہ رانی صاحبہ کو خوش نصیبی سے راجہ کی آنکھ بند ہوتے ہی جواہرات پر حملہ آور ہونے کا موقعہ ہاتھ آ گیا ہو۔ مگر یہ حقیقت اب بھی ایک معمہ سے کم نہیں کہ راجہ صاحب کی غربت اور کوونٹ برادرز کے تمول میں اضافہ۔ دونوں چیزیں ایک ساتھ شروع ہوتی ہیں۔ کیا آپ کے والد مرحوم نے راجہ صاحب کے لئے کوئی اور خدمت عالیہ بھی انجام دی تھی۔"

اب مارٹن کے لئے ٹام کا اندازِ گفتگو ناقابلِ برداشت تھا۔ غصہ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کئی منٹ بعد بڑے ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"تمہاری طعنہ زنی اور دلشکن انداز بالکل بیکار ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ کہ ہمارے کاروبار کا از سر نو مضبوط اور مستحکم ہونا صرف حسنِ اتفاق اور والد صاحب کی موقع شناسی پر منحصر تھا۔ اور میں یقین دلانا چاہتا ہوں۔ کہ اسی قسم کا موقع اس وقت بھی ہاتھ آ رہا ہے۔ جس سے ہم بے اندازہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم ذرا سمجھداری سے کام لیں۔"

اب بھی ٹام نے غیر اطمینانی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے منافع وغیرہ سے انکار نہیں۔ میرا انتشار تو صرف اس قدر ہے۔

کہ اگر ہمیں اپنے گاہکوں کی امانت اس کاروبار میں لگانا ہی پڑ رہی ہے۔ تو یہ چیز ان کے علم و اطلاع میں لانا اصولاً بے حد ضروری ہے۔ اور تم اُسے غیر ضروری ہی نہیں خیال کرتے بلکہ رانی صاحبہ کا روپیہ بغیر ان کی اطلاع کے لگانا بھی شروع کر دیا۔ اور یہ بات میرے خیال میں کھلی ہوئی خیانت اور صریح غیر دیانت داری ہے۔"

مارٹن نے بڑے ترش لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں معلوم تم اپنے آپ اور فرم کو کیا سمجھتے ہو۔ جو اس قسم کے اخلاق و دیانت داری کے درس دے رہے ہو۔ واضح رہے کہ ہمارا فرم بیک وقت بنک بھی ہے اور تاجر بھی۔ اور بنک کے واسطے سٹہ بازی کرنا قطعی ضروری بلکہ لازمی ہے۔ ورنہ وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"لیکن بندہ پرور یہ سٹہ بازی اپنی گرہ کی رقم سے کیجئے نا۔ دوسروں کی رقم پر آپ کا کیا حق ہے!!"

مارٹن کو ونٹ بڑے طیش میں اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

یہ سارا واقعہ ٹام کے واسطے بے حد عجیب اور بڑا دل شکن تھا۔ دیر تک سناٹے میں بیٹھا رہا۔ پھر یکایک کچھ خیال آیا۔ اور گھنٹی بجائی۔ جس کے جواب میں ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ جو باہر جانے کے لئے کوٹ وغیرہ پہن چکی تھی۔ ٹام نے اس کو اس حالت میں دیکھ کر گھڑی پر نظر ڈالی اور خجالت کے لہجے میں بولا۔

"مس میڈ۔ میں نے ناحق آپ کو زحمت دی۔ مجھے بالکل خبر نہ ہوئی کہ

اتنا وقت گزر گیا۔"

مس میڈ نے دلربایانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیر کیا مضائقہ ہے۔ کیا کوئی خط ٹائپ کرانا ہے۔ میں حاضر ہوں۔"

"جی نہیں۔ خط نہیں بلکہ میں رانی پٹیالہ کا حساب دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر آپ تو جانتے ہیں۔ سارے حسابات مس ڈریو رکھتی ہیں۔ میں صرف خط و کتابت کرتی ہوں۔"

"اچھا۔ یہ رانی صاحبہ رہتی کہاں ہیں؟"

"ابھی بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر مس میڈ کمرے سے چلی گئی۔ اور چند منٹ میں واپس آکر کہا۔

"رانی صاحبہ چرلی۔ نیو بری میں رہتی ہیں۔"

"کیا تم رانی سے واقف ہو؟"

"میں نے آج تک صورت بھی نہیں دیکھی۔ مس ڈریو البتہ آتی جاتی ہیں۔ ان کا بیان ہے۔ کہ رانی ہر وقت نقاب ڈالے رہتی ہے۔ خیال ہے کہ شاید چہرے میں کوئی عیب پیدا ہو گیا ہے۔"

کئی منٹ تک خاموش رہنے کے بعد ٹام نے مس میڈ کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اور اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ گو ٹام کا طرز عمل خصوصاً دفتر کے سناٹے میں مس میڈ کے واسطے بڑا غیر معمولی اور مشکوک تھا۔ تاہم اس نے کسی انداز سے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور خاموشی سے انتظار کرنے لگی۔ ٹام نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔

" مس میڈ۔ میں ایک اہم مسئلہ میں تمہیں اپنا ہمراز بنانا چاہتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ تم اس راز کو افشا نہ کرو گی۔ بات یہ ہے۔ کہ رانی پٹیالہ کی بہت بڑی رقم ہمارے فرم میں جمع ہے۔ اور جس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب ہم رومانیہ میں تیل نکالنے کے واسطے ایک پلاٹ لے رہے ہیں۔ ظاہر ہے۔ اس کام میں بہت بڑے سرمائے کی ضرورت ہے۔ مارٹن کا بیان ہے۔ کہ رانی نے اپنا روپیہ پوری آزادی سے اس کام میں لگانے کی ہم لوگوں کو اجازت دے رکھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم آج ہی رات کو رانی صاحبہ سے مل کر یہ دریافت کرو۔ کہ انہوں نے واقعی کتنی رقم لگانے کی اجازت دی ہے۔ بہانہ کر دینا کہ اُن کی تحریر دفتر میں نہیں مل رہی ہے۔ اس لئے دریافت کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اور بالفرض اگر وہ اس تیل کی اسکیم سے لاعلمی اور تعجب کا اظہار کریں تو کوئی اور حیلہ تراشنا۔ مثلاً آپ نہیں۔ کوئی اور گاہک ہے۔ کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے "۔

" لیکن " مس میڈ نے کسی قدر پس و پیش کرتے ہوئے کہا۔

" کیا یہ مناسب نہیں ہو سکتا۔ کہ کل صبح آپ مس ڈریو سے بلکہ یہ باتیں معلوم کر لیں "۔

" بالکل مناسب نہیں۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا۔ کہ اُسے یا مارٹن کو اشارۃً بھی اس کی اطلاع ہو۔ یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان ہے "۔

یہ کہتے ہوئے ٹام نے پانچ پونڈ کا نوٹ مس میڈ کو دیتے ہوئے کہا۔

" نیو بری بہت کافی ٹرینیں جاتی اور آتی ہیں۔ آخری ٹرین چھ بجے ملے گی۔

ابھی پانچ بجا ہے۔ یہ گاڑی بآسانی مل سکتی ہے۔ واپسی کے واسطے ۱۱ بجے رات والی گاڑی موزوں ہوگی۔ ادریں اسٹیشن پہ تمہارا منتظر رہوں گا۔ خدا حافظ۔

×××

رانی پٹیالہ کی کوٹھی نیوبری اسٹیشن سے تقریباً پانچ میل کی دوری پہ بالکل غیر آباد اور سنسان مقام پہ واقع تھی۔ چونکہ مس میڈ کے پاس رقم کافی تھی۔ اس لئے اُس نے یہ فاصلہ پیدل طے کرنے کے بجائے ٹیکسی سے طے کیا۔ جب وہ کوٹھی پہ پہنچی تو بالکل شام ہو چکی تھی۔ اور اس دھندلکے میں رانی صاحبہ کی عالیشان کوٹھی جس میں قبر کی ایسی خاموشی چھائی ہوتی تھی۔ ایک عجیب بھیانک منظر پیدا کر رہی تھی۔ مس میڈ کے گھنٹی بجانے پر چند منٹ بعد ایک ملازم نے پھاٹک کھولا اور خاموشی سے مس میڈ کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔

"کیا رانی صاحبہ پٹیالہ کی یہی کوٹھی ہے"۔

"جی ہاں"۔

"مجھے رانی صاحبہ سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ملنا ہے"۔

"کیا آپ کے واسطے وقت مقرر ہو چکا ہے"۔

یہ سوال بالکل خلاف توقع تھا۔ جس نے مس میڈ کو قدرے پس و پیش میں ڈال دیا۔ تاہم اس نے غیر مشتبہ انداز میں جواب دیا۔

"ہاں۔ وقت مقرر ہو چکا ہے"۔

آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں؟"

یہ سوال بھی بہت پیچیدہ تھا۔ لیکن اس موقع پر بھی مس میڈ نے مصلحتاً دروغ بیانی سے کام لیا۔

"میں نیو یوری سے آ رہی ہوں۔"

"اندر تشریف لے چلیے۔"

پھاٹک کے بعد ایک نہایت پُر تکلف اور دیدہ زیب باغ سے گزر کر ملازم نے کوٹھی کے دروازے پر پہنچ کر مس میڈ کو ایک دوسرے ملازم کے حوالے کیا۔ جو پہلے ملازم کی طرح ہندوستانی تھا۔ اس نے ایک نہایت وسیع ہال کو طے کرنے کے بعد مس میڈ کو ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ جس کی زیب و زینت نے تھوڑی دیر کے لئے مس میڈ کو دنیا و فیہا سے بے خبر کر دیا۔ اس نے اندازہ کیا کہ صرف اس کمرے کے ساز و سامان پر جتنی بے دریغ رقم صرف کی گئی ہے اس سے یقیناً لندن میں ایک خاصی جائداد خریدی جا سکتی ہے۔ ابھی وہ کمرے کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے کسی قدر گردن گھما کر دیکھنا چاہا۔ مگر ساتھ ہی متعجبانہ لہجہ میں کسی عورت کی چیخ سنائی دی اور دروازے کے قریب سوئچ کی طرف ایک زنانہ ہاتھ بڑھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ سارا کمرہ تاریک ہو گیا۔ مس میڈ کی ہلکی سی چیخ کے جواب میں ایک عورت نے قریب ہی سے جواب دیا۔

"آپ خوف نہ کریں۔ بجلی فیل ہو گئی ہے۔ میں شمع منگواتی ہوں۔"

"میں کیسے یقین کر لوں کہ بجلی فیل ہو گئی۔ جب کہ میں نے خود دیکھا ہے۔

کسی نے جان بوجھ کر روشنی گل کی ہے۔"

عورت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور ایک دوسرا سوال کیا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو اور تمہارا کام کیا ہے"؟

"اس کا جواب میں روشنی میں دوں گی۔"

مس میڈ نے درحقیقت بڑے ضبط و استقلال سے کام لیتے ہوئے بظاہر بے خوفی سے جواب دیئے۔ ورنہ وہ مارے خوف کے سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ اب اُسے ساری کوٹھی طلسم معلوم ہو رہی تھی۔ اور یہاں کا ہر متنفس انتہائی خطرناک اور خونخوار نظر آتا تھا۔ اب اس کے لئے انتظار ناممکن تھا عورت کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے سوئچ کی طرف لپکی۔ ابھی تک ہاتھ سوئچ تک نہ پہنچا تھا۔ کہ کسی نے ایک کپڑا اُس کے مُنہ پر ڈال دیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

×××

جب وعدہ ٹام کیمبرلے واپس آنیوالی ٹرین سے کچھ پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ بے چینی سے پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے اب اسے بار بار خیال آ رہا تھا۔ کہ ناحق اس نے ایک ناتجربہ کار چھوکری کو ایسے کام پر بھیجا۔ جو نتائج کے لحاظ سے نہیں معلوم کیا صورت اختیار کرے لیکن اب یہ غور و تشویش بے سود تھی۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ خدا خدا کر کے ٹرین آئی۔ اور تیز قدم چلتے ہوئے ٹام ہر درجہ دیکھ رہا تھا کہ بالکل آخری درجے میں اُسنے میڈ کی صورت دیکھی۔ تو ٹام کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ صورتاً مس

میڈ اور ایک مردے میں کوئی فرق نہ تھا۔

"پناہ خدا۔ تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے۔"

ضعف و نقاہت سے اُس نے ٹام کے بازو کا سہارا لیتے ہوئے صرف یہ جواب دیا۔

"جلد گھر چلو۔"

ٹرین اور اسٹیشن کی نسبتاً کثیف فضا سے نکل کر دونوں جب کار میں روانہ ہوئے۔ تو مس میڈ نے اطمینان کی سانس لی۔ صاف اور تازہ ہوا سے دل و دماغ کو سکون حاصل ہوا۔ اور وہ اس قابل ہوئی کہ اپنی سرگزشت بیان کرے۔

"تمہیں اس کی بالکل خبر نہیں کہ بے ہوش ہونے کے بعد کیا ہوا۔"

"بالکل نہیں۔"

"کیا تم نے رانی کو دیکھا۔"

"جی نہیں۔ اور خدا نہ کرے میں اُسے دیکھوں۔ وہ حقیقتاً بڑی خطرناک عورت ہے۔"

"لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔" ٹام نے کسی قدر برہمی کے لہجہ میں کہا۔ "کہ تمہارے ساتھ اس قسم کی حرکت کیوں کی گئی۔ مجھے بے حد ندامت اور افسوس ہے۔ میں یقیناً رانی سے خود ملکر اس کی شکایت کروں گا۔"

جوش و خروش میں حضرت کہنے کو تو یہ سب کچھ کہہ گئے۔ مگر بعد کو خود ہی دل میں سوچا کہ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں اس کی شکایت کروں۔

خود رانی صاحبہ اٹھے یہ اعتراض اور شکایت کر سکتی ہیں کہ میں نے مس میڈ کو وہاں کیوں بھیجا۔ ابھی وہ اس نازک مسئلہ کے نشیب و فراز پر غور ہی کر رہے تھے کہ مس میڈ نے کہا۔

"خدا کے واسطے یہ شکوہ شکایت کچھ نہ کیجئے گا۔ میں اس واقعہ کو ایک ڈراؤنے خواب کی طرح بھول جانا چاہتی ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا جس کے سامنے پہنچ کر ٹام نے کار روک لی۔

"اگر زحمت نہ ہو تو آپ اس وقت تک انتظار فرمائیں کہ میں مکان کے اندر پہنچ جاؤں۔ سچ یہ ہے۔ کہ اس ہیبت ناک واقعہ نے ہوش و حواس کو ابھی تک پراگندہ کر رکھا ہے"۔

اس میں شبہ نہیں کہ مس میڈ کا سارا جسم ہنوز کانپ رہا تھا۔ ٹام نے یہ کیفیت دیکھی تو کار کا دروازہ خود کھول کر اُسے سہارا دیکر نیچے اتارا۔ اور مس میڈ کے پس و پیش کو نظر انداز کرتے ہو وہ اس کے ساتھ دوسری منزل تک گیا جہاں اس کا کمرہ واقع تھا۔ کمرہ کا قفل بھی ٹام نے کھولا۔

"میں باہر کھڑا ہوں۔ آپ اندر جا کر روشنی کر لیں"۔

اندر پہنچ کر روشنی کرتے ہی مس میڈ کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی جسے سنتے ہی سارے آئین اخلاق و تہذیب کو پس پشت ڈالتے ہوئے ٹام کمرے میں داخل ہو گیا

دیکھا کہ مس میڈ حیرت و خوف سے کمرے کے چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔

جس میں کاغذات، کپڑے، اور مختلف چیزیں نہایت بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"یقیناً۔ کسی نے یہاں آکر میری ہر چیز کا جائزہ لیا ہے"!

یکایک ٹام نے جھک کر فرش سے ایک چمکدار چیز اٹھائی روشنی میں بغور دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ کسی وردی کا بٹن تھا جس پر ایک خاص قسم کا نشان کندہ تھا۔ اس نشان کو دیر تک دیکھتے کے بعد مس میڈ نے حیرت انگیز لہجہ میں کہا۔

"میں سمجھ گئی۔ اسی قسم کا نشان میں نے رانی پٹیالہ کے دربان کی وردی میں دیکھا تھا۔

——×××——

دوسرے دن مس میڈ کسی قدر سویرے ہی دفتر پہنچ گئی۔ لیکن مارٹن کومونٹ کی سیکرٹری گریس ڈریو اس سے بھی پہلے دفتر میں موجود تھی۔ یہ ایک پچیس سالہ خوش مزاج۔ خوش اخلاق اور خوش رو عورت تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ نہ صرف مارٹن کی سکریٹری بلکہ ان کی منظور نظر بھی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ مس میڈ کا چہرہ بالکل سفید، آنکھیں خوفزدہ اور حرکات و سکنات بے انتہا مضمحل تھے۔ لیکن اُس نے کوئی سوال اس بدلی ہوئی حالت کے متعلق اس وقت تک نہیں کیا۔ جب تک کہ مس میڈ کوٹ اتار کر اطمینان سے اپنی جگہ پر نہیں بیٹھ گئی۔

"کیا تم کل رانی پٹیالہ کے یہاں گئی تھیں"۔

اس معمولی سے سوال نے مس ہیڈ کو بے انتہا متحیر اور کسی حد تک سراسیمہ کر دیا۔ اس نے اعتراف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں گئی تو تھی۔ مگر آپ کو کیسے علم ہوا۔"

"ابھی ابھی مانی صاحبہ نے ٹیلیفون پر سارا واقعہ بیان کیا۔ اور تمہارے ساتھ جو سلوک ہوا۔ اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے معافی چاہی ہے۔ کیا واقعی ان کا رویہ خلافِ تہذیب، اور قابلِ اعتراض تھا۔"

مس ہیڈ نے سارا واقعہ اختصار کے ساتھ بیان کر دیا۔ جس کو گریس ڈریو نے بہت دلچسپی سے سُنا۔ اور خود بھی اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی وہ عجیب قماش کی عورت ہے۔ میرا تو خیال کیا یقین ہے۔ کہ اس کا دماغ خراب ہے۔ تم نے اُسے دیکھا بھی۔"

"جھلک بھی نہیں دیکھ سکی۔"

"مجھ سے جب بھی اس نے گفتگو کی ہمیشہ نقاب کے اندر سے یا پردے کی آڑ سے۔ مارٹن کا خیال ہے کہ اس کے چہرے میں کوئی خاص بدنمائی ہے۔"

"کچھ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس غریب کے ساتھ بڑا فریب کیا گیا۔"

"کیا معنی۔ کیسا فریب"۔ ڈریو نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ اُسے پھانس کر ایک ہندوستانی کے حوالہ کر دیا گیا۔"

"کم از کم اس کی تلافی اس طرح تو ہو گئی کہ آج وہ لاکھوں پونڈ کی تنہا مالک ہے۔"

"لیکن دنیا میں زندگی کا مقصد صرف روپیہ پیسہ ہی تو نہیں ہوا کرتا۔"

مس میڈ نے طعنہ زنی کے لہجہ میں کہا۔

"خیر چھوڑو اس قصہ کو۔ ہاں تمہیں مسٹر مارٹن کے روبرو جواب دینا ہو گا۔ کہ تم رانی صاحبہ کے یہاں کیوں گئیں۔ رانی صاحبہ کا ایسا ہی حکم ہے"۔

"اس میں کون سے جرم کی بات تھی۔ میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی جواب نہیں کہ ہاں گئی۔ اور .... ہدایت کے بموجب گئی"۔

"غالباً مسٹر ٹام نے کہا ہو گا"۔

مس میڈ نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ مس ڈریو نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔ چند منٹ کے بعد مس ڈریو نے کہا۔

"آج رانی صاحبہ دفتر آ رہی ہیں۔ کہو تو میں تم سے ملاقات کرا دوں"۔

"معاف کیجئے۔ بہت بہت شکریہ۔ میں ایسی ملاقات سے در گزری رکیا اس سے پہلے بھی وہ دفتر آئی ہیں"۔

"ہاں۔ کم از کم مہینہ میں ایکبار ضرور آتی ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ دفتر کے اندر نہیں آتیں۔ بلکہ مجھے باہر جا کر ان سے موٹر میں بات کرنا ہوتی ہے"۔

مارٹن اور ٹام اُس روز دفتر میں قریب قریب ایک ساتھ داخل ہوئے۔ اور ٹام چند منٹ اپنے کمرے میں ٹھہرنے کے بعد مارٹن کے کمرے میں چلا گیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت نہایت صفائی سے تم سے بات کرنے آیا ہوں"۔

"ایسا کرنا غلطی ہو گی"۔ مارٹن نے از راہ تمسخر جواب دیا۔

ٹام نے مارٹن کے فقرے کو نظر انداز کرتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔
"یہ واقعہ ہے کہ روما بنہ کے تیل اور رانی پٹیالہ کے روپیہ کے معاملہ میں تمہارا رویہ اس وقت تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"تمہارا نہ سمجھنا ہی بہتر ہے۔"

"سنو۔ ابھی میں نے پوری بات نہیں کہی۔" ٹام نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "حالات سے مجبور ہو کر میں نے کل شام میڈ کو رانی صاحبہ کے یہاں بھیجا تھا"

"تم نے انتہائی گدھا پنا کیا۔ یہ بڑے گھٹیا قسم کی بات ہے۔"

"اگر تم ان معاملات میں اخلاق و تہذیب کو درمیان لانا چاہتے ہو تو میرا دعویٰ ہے کہ میرا پلہ بھاری ہوگا۔ حقیقتاً تم نے اب بھی پوری بات نہیں سُنی۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ میں نے کل میڈ کو رانی کے یہاں بھیجا تھا۔ جہاں مجھے افسوس ہے اس کے ساتھ بہت نامناسب اور تہذیب سے گرا ہوا سلوک کیا گیا۔"

غصے میں کانپتے ہوئے مارٹن نے جواب دیا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ کہ اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا گیا۔ سلوک جائے جہنم میں۔ سوال تو یہ ہے۔ کہ تم نے فرم کے ایک معمولی ملازم کو میرے خلاف تفتیش حال کے واسطے کیوں روانہ کیا۔ نیز یہ بھی یقینی ہے کہ تم نے اُسے اس معاملہ میں ہمراز بنایا ہوگا۔ اور تمہاری یہ حرکت نہایت اوچھی ہے۔"

"اور شاید اس سے بھی زیادہ اوچھی حرکت ابھی اور ہوگی۔" ٹام نے پرکون لہجہ میں کہا۔ "یعنی میں رانی صاحبہ کا حساب دیکھنا چاہتا ہوں۔"

دونوں آدمی سوال وجواب میں اس قدر منہمک تھے کہ انہیں مطلق خبر

نہ ہوئی۔ کہ مس ڈریو دستک دیکر کمرے میں داخل ہو چکی ہے۔ طام کے جواب میں مارٹن نے بدستور غصہ اور برہمی کے لہجہ میں کہا۔

" رانی صاحبہ کا حساب ہی نہیں بلکہ تم سارے حسابات دیکھ لو۔ کیونکہ میرا خیال ہے ان حالات میں میں فرم کو نہیں چلا سکتا۔"

" بالفاظ دیگر تم حصہ داری ختم کرنا چاہتے ہو۔"

" بلیشک۔"

" تو بہتر ہو گا کہ ہم کسی مستند فرم کے ذریعہ پہلے اپنے حساب کی جانچ کرائیں۔ کیونکہ میں بھی اس عجیب و غریب قسم کے کاروبار سے دست بردار ہونا چاہتا ہوں۔"

" میں عجیب و غریب کاروبار کا مطلب نہیں سمجھا۔"

" تم نے کل ہی مجھ سے بتلایا کہ درحقیقت ہمارے فرم کو از سر نو زندہ کرنے اور مضبوط بنانے میں ایک معصوم عورت کے عزت و ناموس کی قربانی شامل ہے۔ تم کو اس پر بھی فخر ہے کہ ہمارے فرم میں اور چیزوں کے علاوہ بردہ فروشی کا کاروبار بھی ہوتا ہے ....."

" سبحان اللہ۔ معصوم عورت کی بھی خوب کہی۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ تھیٹر کی معمولی چھوکری تھی۔"

" اگر وہ اس سے بھی پست معیار کی ثابت ہوتی تب بھی مجھے یہ کہنے میں باک نہیں۔ کہ وہ ایک غیرت مند عورت تھی اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک بدترین قسم کا ظلم تھا۔"

"واضح رہے کہ یہ حملہ براہ راست والد مرحوم پر ہے" مارٹن نے برافروختہ ہو کر کہا۔

"میرا روئے سخن صرف فرم اور تم سے ہے۔ میں پھر کہتا ہوں، کہ تم نے رانی کی لاعلمی میں اس کا روپیہ ایک مشکوک کاروبار میں لگا کر اپنی دیانتداری اور خلوص کا کچھ اچھا ثبوت نہیں دیا۔"

"دیکھو ٹام میں بھی صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ مجھے اس کی قطعی پروا نہیں کہ رانی کے عزت و ناموس کو بٹہ لگایا۔ ہمیشہ کے واسطے اس کی زندگی خراب ہو گئی۔ بہر صورت ہمارا فرم تباہی سے بچ گیا۔ اور اب بھی اگر خدانخواستہ اس قسم کا موقع آجائے تو بھٹیر کی ایک چھوکری کیا ہزاروں آبرو باختہ چھوکریوں کو بھینٹ چڑھاتے میں دریغ نہ کروں گا۔"

"یہ شعار تمہیں مبارک رہے۔ حسابات کی جانچ کرانے کا انتظام جتنی جلد ممکن ہو بہتر ہے۔"

یہ کہتے ہوئے ٹام کمرے سے باہر چلا گیا۔

"اور آپ کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو گی۔"

یہ جملہ ٹام کے جواب میں مس ڈریو نے نہایت پرسکون لہجہ میں ادا کیا جس نے پہلی بار مارٹن کو ڈریو کی موجودگی سے آگاہ کیا۔ وہ حیرت زدہ ہو کر پیچھے مڑا اور سوال کیا۔

"کس کی اور کون سی خواہش پوری نہ ہو گی۔"

"حسابات کی جانچ کرانے کی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ بڑے اطمینان سے مارٹن کے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر جلانے لگی۔ مارٹن نے بھی ایک سگریٹ لے کر جلایا۔ اور چند منٹ تک بہت متفکرانہ انداز میں مس ڈریو کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ رازدارانہ انداز میں بولا۔

"مس ڈریو تم فرم کے بہت سے خفیہ حالات سے واقف ہو۔"

"یقیناً۔ اور اگر تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے پورا نہ کیا تو میری واقفیت تمہیں جیل کی ہوا کھلا سکتی ہے۔"

"مس ڈریو۔ فرم دیوالیہ ہونے کو ہے۔"

"اسی لئے تو میں نے کہا کہ ٹام کی یہ خواہش کہ حسابات کی جانچ کرائی جائے۔ کبھی پوری نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں تم گاہکوں کی رقم کو بُری طرح خورد بُرد کر چکے ہو۔ اور اب بھی کر رہے ہو۔"

اس میں تو کوئی شبہ نہیں۔ مگر اب کیا کیا جائے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"کیوں نہ ٹام کو نقد ایک رقم دیکر کہا جائے کہ وہ اپنی شرکت سے دست بردار ہو جائے۔"

"تجویز بڑی معقول ہے لیکن سوال یہ ہے۔ کہ وہ اسے منظور کیوں کرنے لگا۔"

"کیوں نہیں۔ اگر خاصی رقم دی جائیگی۔ تو وہ ضرور منظور کر لے گا۔ ورنہ جانچ وغیرہ کے جھمیلے میں اگر پڑے تو سمجھ لو مصیبت آگئی۔"

"واللہ بڑی اچھی ترکیب ہے۔ میں ضرور کوشش کروں گا کہ وہ منظور کر لے۔ میں روپیہ کا انتظام کر سکتا ہوں۔"

"لیکن ..... کیا ....." مسز ڈریو نے افسردگی سے کہا

"کیا تمہیں شبہ ہے کہ رقم کا انتظام نہ ہو سکے گا۔"

"نہیں۔ میں رقم کے متعلق نہیں کہہ رہی تھی۔ بلکہ میں تم سے یہ دریافت کرنا چاہتی تھی کہ کیا واقعی، جیسا تم نے ابھی کہا تھا کہ تم ایک کیا ہزار عورتوں کو قربان کرنے میں دریغ نہ کرو گے۔"

"سوائے تمہارے۔ میری جان۔"

—x-x-x—

ٹام کیتمبرلے اپنے کمرے میں واپس آیا اور مس میڈ کو بلا کر کہا۔

"ڈورا میں فرم سے علیحدہ ہو رہا ہوں۔"

"کیا لڑائی کر بیٹھے۔"

"ہاں کچھ یوں ہی سمجھ لو۔ میں حسابات کے معاملہ میں ہنوز تاریکی میں ہوں۔"

"کیا گذشتہ رات کے واقعہ کا بھی کوئی ذکر آیا تھا۔"

"نہیں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر رانی نے تمہارے ساتھ یہ حرکت کیوں کی۔"

"مجھے بھی حیرت ہے۔ ڈریو سے تذکرہ آیا۔ اس کا خیال ہے کہ رانی کے دماغ میں کچھ فتور ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ ۔ اچھا فتور ہے۔ کہ اپنے گھر میں کسی کو بلا کر کمبل ڈال دیجئے۔ خیر اب چونکہ میں علیحدہ ہو رہا ہوں اس لئے ان چیزوں سے سروکار نہیں۔"

اس نے مس میڈ کو چند خطوط لکھوائے۔ مگر بڑے انتشار و فکر کے عالم میں کیونکہ اس کی طبیعت بے حد مکدر اور آزردہ تھی۔ بڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اور کچھ دیر بعد کھڑکی سے نیچے دیکھنے لگا۔ جہاں سے سڑک کی چہل پہل صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا ایک بہت خوبصورت اور صاف و شفاف کار دفتر کے سامنے آ کر رُکی۔ جس کی کھڑکیوں پر بہت دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ ابھی وہ اس بات پر غور ہی کر رہا تھا کہ اس قدر حسین کار کا مالک کون ہو سکتا ہے کہ مس میڈ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور گھبراتی ہوئی بولی۔

"رانی آئی ہے رانی۔ عجب نہیں شکایت کرنے آئی ہو۔"

"میں خود اُس سے ملونگا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ٹوپی پہنی اور جلد جلد زینہ سے اتر کر فٹ پاتھ پر پہنچا ہی تھا۔ کہ موٹر آہستہ آہستہ رینگنے لگی اور ہمیں ڈریو مودبانہ جھک کر سلام کا جواب دے رہی تھی۔ اب وہ ڈریو کے نزدیک پہنچ چکا تھا جس نے اسے دیکھ کر کہا۔

"رانی صاحبہ آئی تھیں۔ کیا آپ کو کبھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے؟"

"کبھی نہیں۔ لیکن میرا خیال تھا کہ وہ جوان عورت ہوگی۔"

"ہے تو وہ یقیناً جوان"۔

"اگر وہ رانی صاحبہ کا ہاتھ تھا جس کو میں نے کھڑکی کا پردہ درست کرتے ہوئے دیکھا ہے تو میرا دعویٰ ہے کہ نہ وہ ایک انگریز عورت کا ہاتھ تھا اور نہ جوان عورت کا"۔

"یہ آپ کو کیسے اندازہ ہوا" ڈریو نے متعجبانہ سوال کیا۔

"تم نے شاید کبھی ایک ہندوستانی کا ہاتھ نہیں دیکھا۔ اگر موقع ملے تو تم دیکھو گی کہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہر ناخن کے سرے پر میل کی وجہ سے نصف چاند کا نیلا نشان ضرور ہوگا"۔

جہاں تک ٹام کیتبرے کا تعلق تھا۔ آج چھ گھنٹے کے درمیانی وقفہ میں بڑا اہم انقلاب رونما ہوگیا۔ مس ڈریو کے مشورے کے بموجب مارٹن کو ونٹ نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنے حصے کی نقد ایک رقم لے کر ہمیشہ کے لئے فرم سے دست بردار ہو جائے۔ پہلے تو اس تجویز کے منظور کرنے میں اسے قدرے تامّل اور پس و پیش ہوا۔ مگر رقم کی پیشکش چونکہ اس کی توقعات سے بہت زیادہ تھی، اس لئے قلم اٹھا کر روپیہ کی رسید اور شراکت سے دست برداری تحریر کر دی۔ اور دفتر سے جاتے ہوئے مس میڈ سے کہا۔

"ڈورا۔ اب میں فرم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں۔ اور میری خواہش ہے کہ آج رات کا کھانا ہم تم ساتھ کھائیں"۔

"کیا کہا۔ آپ ہمیشہ کے لئے فرم چھوڑ رہے ہیں"۔ مس میڈ نے متحیر ہو کر دریافت کیا۔

"اس کی تفصیل انشاء اللہ کھانے پر بتاؤں گا۔ وعدہ کرو۔ آؤ گی نا"۔

"انشاء اللہ ضرور آؤں گی"۔

حسبِ وعدہ مس میڈ نے ٹام کے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ جس کے دوران میں ٹام نے فرم سے علیحدگی کے تفصیلی حالات بیان کئے۔ اور آخر میں اُس نے ہنستے ہوتے کہا۔

"خیر یہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ لیکن آج ہی صبح مجھے ایک ایسی چیز کا پتہ چلا ہے جو اس واقعہ سے کہیں زیادہ اہم اور دلچسپ ہے"۔

"وہ کون سی بات ہے۔ میں بھی تو سنوں"۔

"تمہیں علم ہے کہ تمہارے اطلاع دینے پر میں فوراً نیچے سڑک پر رانی صاحبہ سے اس واقعہ کے متعلق گفتگو کرنے گیا تھا جو ان کی کوٹھی پر تمہارے ساتھ پیش آیا۔ میں جیسے ہی سڑک پر پہنچا ان کی کار جنبش میں آچکی تھی۔ تاہم گاڑی کے اندر مجھے ایک عورت کا ہاتھ نظر آیا جو کھڑکی کا پردہ برابر کر رہا تھا۔ یہ ہاتھ نہ صرف یہ کہ ایک انگریز عورت کا نہ تھا۔ بلکہ ایک ایسی مشرقی خاتون کا ہاتھ تھا۔ جس کی عمر یقیناً چالیس اور پچاس کے درمیان ہو گی"۔

"مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ رانی ایک برطانوی خاتون اور......"

"نوجوان ہے"۔ ٹام نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے بھی یہی سُنا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے۔ یہ رانی ہرگز نہیں ہے بلکہ

اس پردے میں کوئی زبردست کھیل کھیلا جارہا ہے"۔

"اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے"؟

"میرا قیاس تو یہ ہے کہ رانی لندن میں ہے ہی نہیں۔ یا فوت ہوچکی ہے۔ اور کوئی دوسری شخصیت پس پردہ اس کی جانشینی کر رہی ہے۔ آج میں نے رانی کا حساب بھی بغور دیکھا۔ پتہ چلا کہ دو سال ہوتے جب ان کا حساب ہمارے یہاں چھ ہزار پونڈ سے کھولا گیا تھا۔ لیکن چھ مہینے کے اندر اندر یہ ساری رقم نیو بری میں تعمیر مکان اور اس کی زیب و زینت میں صرف ہوگئی۔ صرف چند پونڈ کا بقایا رہ گیا تھا۔ البتہ اس کے بعد سے ہندوستان سے باقاعدہ رقوم آنا شروع ہوگئی ہیں۔ اور اس وقت بہت کافی رقم اس کے حساب میں موجود ہے"۔

"لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ رانی ایک انگریز عورت ضرور ہے۔ ڈورا کا بیان ہے کہ بارہا اُسے گفتگو کا موقع ملا ہے اور وہ بہترین انگریزی بولتی ہے"

"مگر یہ بھی کہو کہ ڈورا نے کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی"۔ ٹام نے طعنہ زنی کے لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ تو صحیح ہے کہ اس نے ہمیشہ رانی کو نقاب پوش دیکھا"۔

"اچھا کیا ڈورا نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے ہر موقع پر رانی کو اچھی انگریزی بولتے ہوئے سُنا کاش میں ڈورا سے اس مسئلہ میں تفصیلی گفتگو کر سکتا"۔

"کیوں نہ ہم لوگ اسی وقت چل کر ڈورا سے ملیں"۔ مس میڈ نے تجویز پیش کی۔

"کیا وہ مکان ہی پر ہو گی۔ اس وقت نو بجا ہے"

"ضرور ہو گی۔ اس کا بیان ہے کہ شام سے صبح تک مکان پر سوائے مضمحل پڑے رہنے کے دوسرا کوئی مشغلہ ہی نہیں ہے"

"کیا تمہیں پتہ معلوم ہے؟" ٹام نے پوچھا

"اچھی طرح۔ ۱۲۳ کنگ کرافٹ مینشن"

دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر مذکورہ بالا پتہ پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ کمرہ ۱۲۳ پانچویں منزل پر واقع ہے۔ مگر خوش نصیبی سے بلڈنگ میں ایک چھوڑ دو لفٹ لگے ہوئے تھے۔ لفٹ والے سے ڈورا کے متعلق دریافت حال پر معلوم ہوا کہ وہ یقینی نہیں کہہ سکتا کہ ڈورا اپنے کمرے میں ہے۔ کیونکہ کبھی وہ ایک لفٹ سے آتی جاتی ہے اور کبھی دوسرے سے۔ کم از کم اُس نے بہت روز سے اُسے نہیں دیکھا۔"

ٹام نے اوپر پہنچ کر گھنٹی بجائی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ دروازے پر دستک دی لیکن اس کا بھی جواب ندارد۔ بالکل اتفاقیہ اس کا ہاتھ لیٹر بکس کے لٹکتے ہوئے ڈھکنے پر پڑا۔ اور اُس نے متحیر ہو کر کہا۔

آئیں یہ کیا۔ لیٹر بکس میں تو خطوں کا انبار ہے۔ یا تو مس ڈیو کی ڈاک بہت زیادہ آتی ہے۔ اور یا اُس نے عرصہ سے لیٹر بکس ہی نہیں کھولا۔"

یکایک اس کی نظر دروازے کے زیریں حصہ پر پڑی۔ یہاں اخبار کا ڈھیر تھا۔ اس نے دو ایک کو اٹھا کر دیکھا جو مختلف تاریخوں کے تھے۔ سب سے پرانا اخبار پانچ دن پہلے کا تھا۔ واپسی کے لئے وہ دوسری لفٹ کی طرف گیا۔

دریافت کرنے پر لفٹ والے نے جواب دیا۔

"جی نہیں"۔ میں نے مس ڈریو کو کئی دن سے نہیں دیکھا۔ اور وہ اکثر ہفتوں غائب رہتی ہے۔ درحقیقت وہ یہاں بہت کم قیام کرتی ہے۔ علاوہ اس کے ان کا ایک چھوٹا سا مکان کینٹ میں بھی ہے۔ اس لئے غالباً وہ وہیں زیادہ قیام کرتی ہے۔"

ٹام اپنی جائے قیام پر واپس آیا۔ مگر عجیب قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا تھا۔ قریب قریب تمام رات اسی ادھیڑ بُن میں کٹی۔ رانی صاحبہ کا معمہ تو رہا الگ اب مس ڈریو کا قصہ سمجھ میں نہیں آتا۔ بہت سے حل اس کے دماغ میں آئے۔ مگر کہیں نہ کہیں اس میں رخنہ ضرور تھا۔ جس کی وجہ سے پورا طور پر مطمئن نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صبح وہ معمول سے بہت پہلے ہی اٹھ بیٹھا۔ اور حوائج ضروری سے جلد جلد فارغ ہو کر سیدھا ڈریو کے جائے قیام کی طرف روانہ ہو گیا۔ سڑک سے گزر کر اوپر جانے کے لئے وہ لفٹ کی طرف چلا ہی تھا کہ ایک بہت بڑی گاڑی جس کے پہیوں کی کیچڑ سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت لمبی مسافت طے کرکے آرہی ہے مکان کے روبرو آکر رکی۔ ایک عورت کار سے باہر آئی جو سر سے پاؤں تک لبادہ اوڑھے تھی۔ اور چہرے پر نقاب پڑی تھی۔ اس کے اُترتے ہی کار روانہ ہو گئی۔ اور وہ تیز قدم چلتے ہوئے لفٹ کی طرف جانے لگی۔ ٹام کو شبہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن اب اس کے پاس سے گزرنے پر یقین ہو گیا کہ یہ مس ڈریو ہے۔ اس نے آہستہ سے ایک ہاتھ ڈریو کے شانے پر رکھ دیا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور حیرت و استعجاب سے ایک ہلکی چیخ نکلی۔

" آئیں۔ مسٹر ٹام آپ کہاں "؟

" میں ایسے ناوقت آپ کو زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔ مگر میں کل رات کو بھی حاضر ہوا تھا "۔

" مجھے افسوس ہے۔ کل میں مکان پر نہ تھی۔ درحقیقت ایک مختصر سا مکان کینٹ میں بھی ہے۔ وہاں میرے ایک دوست نے روک لیا۔ اور انہیں کی کار مجھے اس وقت یہاں پہنچا گئی ہے "۔

" مجھے رشک ہے کہ خوش نصیبی سے آپ ایسے بہترین دوست رکھتی ہیں۔ خیر اب میں آپ کو مزید زحمت نہ دوں گا۔ آپ جا کر آرام فرمائیں۔ اور میں جس غرض کے لئے حاضر ہوا تھا وہ پھر عرض کروں گا "۔

" بہت بہت شکریہ " مس ڈریو نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور ٹام جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ پھر اس نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

" مسٹر ٹام۔ غالباً آپ کو میرا موجودہ رویہ اور طرزِ عمل بہت مشکوک نظر آ رہا ہو گا۔ اور گو اصل حقیقت کو میں اب بھی پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا اظہار کم از کم آپ سے ضروری ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ زیادہ نہیں دو ایک دن اُسے اپنے ہی تک رکھیں گے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ میری اور مارٹن کوونٹ کی بہت جلد شادی ہونے والی ہے "۔

" مجھے یہ خبر سُن کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ اطمینان رکھیں میں کسی پر اس راز کو ظاہر نہ کروں گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس چیز کے لئے آپ قابلِ مبارک باد ہیں یا مارٹن "۔

"دو ایک دن میں ہی اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا"۔

"خدا حافظ"۔

یہ کہہ کر مس ڈربو ہنستی ہوئی لفٹ کی طرف چلی گئی اور ٹام اپنے جائے قیام کی طرف۔ اب مس ڈربو کا معمہ ٹام کے واسطے معمہ نہ تھا۔ سارا راز آئینہ تھا۔

—×××—

گو ٹام نے مس ڈربو سے رازداری کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم ایک ہستی اس سے مستثنیٰ تھی۔ اور اس کا کوئی راز ایسا نہ تھا۔ جسے وہ مس میڈ سے پوشیدہ رکھ سکتا۔ اس کا ایک اہم سبب تھا۔ آج سہ پہر کو جب کہ وہ گرین پارک میں مس میڈ کے ہمراہ ٹہل رہا تھا۔ تو اس کے دل کی حرکت تیز تھی اور سارا بدن خوشی سے کانپ رہا تھا۔ دماغ مسرت و انبساط کی کیفیت سے معمور تھا۔ اور ہر طرف حدِ نگاہ تک سوائے مس میڈ کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اُسنے اپنی ملاقات اور مس ڈربو کی مجوزہ شادی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

"ڈورا۔ ہمارے لئے اس سے بہتر قابلِ تقلید مثال دوسری نہیں ہو سکتی مارٹن نے خلاف توقع بہت کافی رقم کی پیشکش کی۔ جسے میں نے منظور کرتے ہوئے فرم سے دست برداری کر لی۔ اب میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے لئے مجھے ایک شریکِ کار کی ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے۔ اس کے لئے تم سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ جو بیک وقت میری شریکِ حیات بھی ہو گی اور شریکِ کار بھی"۔

ایک دلربایانہ تبسم کے ساتھ مس میڈ نے جواب دیا۔

"مجھے آپ کی تجویز سے انکار تو نہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ کام غیر معمولی عجلت سے کیا جا رہا ہے"۔

"نیک کام میں نہ غور و فکر کی ضرورت ہونا چاہیئے۔ اور نہ تاخیر کی"۔

مذکور الصدر واقعہ کے بعد اگر ایک طرف ٹام کیمبرلے اور مس میڈ کیلئے ہر دن روزِ عید اور رات شب برات تھی۔ تو دوسری طرف مارٹن کوونٹ پر الام و مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ انتشار اور پریشانیوں میں گھرتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کی زندگی باردوش ہو رہی تھی۔ سٹہ بازی کا بازار یکایک سرد ہو گیا۔ ایران میں گڑبڑ کی مختلف افواہوں نے اس قدر اہمیت اختیار کی۔ کہ رومانیہ کی حکومت ہی بدل گئی اور کوونٹ برادرز کے تیل نکالنے کی تجویز ردی کی ٹوکری میں ڈال دی گئی۔ بڑے بڑے مضبوط فرموں کے حصے جنسِ ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ تاہم مارٹن نے بڑی پامردی اور مستقل مزاجی سے ان انقلابات کا مقابلہ کیا۔ اور ایک دن بنک جا کر بڑی چالاکی اور عیاری سے کثیر رقم کیش کی صورت میں برآمد کر لی۔ دفتر آ کر اس نے مس ڈریو کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

"پیاری گریس اپنا اسباب وغیرہ باندھ کر اٹلی چلنے کے واسطے فوراً تیار ہو جاؤ۔"

"اچھا۔ یہ نوبت آ ہی گئی"۔

"ہاں جو نہ ہونا تھا وہ ہو کر ہی رہا"۔

"لیکن ہماری شادی کب ہوگی"۔ مس ڈریو نے قدرے گھبرائے ہوئے

لہجے میں سوال کیا۔

"پیاری۔ سرِدست اس کا بالکل موقع نہیں ہے۔ اس لئے یہ چیز ملتوی کرنا پڑے گی۔"

"اور جناب کا منشاء یہ ہے کہ میں بغیر شادی کے آپ کی ہمسفر ہوں۔"

"کیوں کیا میرا اعتبار نہیں رہا۔"

"سوائے اعتبار کرنے کے اور صورت ہی کیا ہے۔ کس وقت کی ٹرین سے روانگی کا ارادہ ہے۔"

"ٹھیک نو بجے مجھے اسٹیشن پر مل جانا۔"

"بہتر ہے۔ لیکن فرم کے گاہکوں کا کیا حشر ہوگا۔"

"چھوڑو کم بخت گاہکوں کو۔" مارٹن نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"غریب رانی پٹیالہ کو یہ دوسرا چرکہ فرم کی طرف سے پہنچیگا۔ گزشتہ موقع پر میرے باپ نے بدرجہ مجبوری یہ حرکت کی تھی۔ اور آج میں حالات سے مجبور ہو کر ایسا کر رہا ہوں۔"

"مگر فرض کرو اس کی خبر ہو جاتے کہ تم فرار ہو رہے ہو۔"

"میں بچہ نہیں ہوں۔ سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔ آج جمعہ ہے۔ ہفتہ کو میں دفتر جاتا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو شنبہ کو یہ راز افشا ہو سکتا ہے مگر ہم اتوار ہی کو جہاز پر سوار ہو جائیں گے۔"

حسبِ وعدہ مس گریس نو بجے رات کو اسٹیشن پہنچ گئی۔ جہاں مارٹن پہلے سے موجود تھا۔ بوٹ ٹرین میں عموماً بہت کم مسافر ہوتے ہیں اس

لئے یہ دونوں اپنے درجہ میں تنہا تھے۔ مختصر یہ کہ اس وقت تک ہر چیز مارٹن کے حسب منشا انجام پا رہی تھی۔ اور وہ بھی بغیر کسی زحمت کے۔ گریس کے برابر اطمینان سے بیٹھتے اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے مارٹن نے پیار کے لہجہ میں کہا۔

"گریس۔ آخر کار ہماری اسکیم مکمل ہو ہی گئی۔ کیوں۔ تم کچھ پریشان سی ہو"۔

"نہیں۔ مجھے تو کوئی پریشانی نہیں"۔

آغوش کو تنگ اور زیادہ تنگ کرتے ہوئے مارٹن نے کوٹ کی اندرونی جیب سے چمڑے کا ایک بڑا بٹوہ نکالا جس کی جسامت میں نوٹوں نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ بٹوہ گریس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے مسرور لہجے میں مارٹن نے کہا۔

"روپیہ بھی عجیب چیز ہے۔ بظاہر یہ بٹوہ ایک حقیر سی شے نظر آتی ہے مگر حقیقتاً ہم لوگوں کی آئندہ زندگی کا عیش و آرام اس کے اندر محفوظ ہے"۔

گریس نے بٹوے کو اپنے اور مارٹن کے درمیان سیٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اور کتنے غریبوں کی تباہی اس کے اندر بند ہے۔ میرے خیال میں رانی پٹیالہ تو بالکل برباد ہو جائیگی"۔

"لاحول ولا قوۃ۔ بھلا ایسی کسبیاں کہیں تباہ و برباد ہوتی ہیں۔ بالفرض اگر رانی صاحبہ آج مفلس بھی ہو گئیں تو کل پھر کہیں کی ملکہ بن جائے گی"۔

گریس مارٹن کی آغوش سے علیحدہ ہو کر اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ

گئی اور اپنا سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سُلگانے لگی۔ مارٹن نے بھی ہاتھ بڑھا کر ایک سگریٹ لے لیا۔ اطمینان سے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولے۔

"کیوں تم الگ کیوں بیٹھ گئیں"۔

"اس لئے کہ تمہیں سردست اپنا دل و دماغ پرسکون رکھنے کی ضرورت ہے۔ نہیں معلوم کیا افتاد پڑے"۔

سگریٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے مارٹن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"فرم تو دیوالیہ ہو ہی گیا۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ بہت سے گاہک اب اپنے بقایا روپیہ کے واسطے ٹام کی گردن پکڑیں گے"۔

"اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ اپنے گاہکوں کا روپیہ بھی لیکر فرار ہو رہے ہیں"۔

"پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہے"۔

یکایک مارٹن نے مُنہ سے سگریٹ نکال کر اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"گریس، تم کس قسم کے سگریٹ پیتی ہو۔ اس نے تو دماغ کو بالکل چرخہ بنا دیا"۔

یہ کہتے ہوئے مارٹن نے کھڑے ہو کر کھڑکی کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن گریس نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"خبردار۔ اپنی جگہ سے جنبش نہ کرنا"۔

ابھی وہ پوری طرح کھڑے ہونے کی کوشش کر ہی رہا تھا۔ کہ اس کی کانپتی

ہوئی ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ اور بھدے سے اپنی جگہ پر گر پڑا۔ گریس کے بدلے ہوئے انداز اور لب و لہجہ پر اُسے سخت تعجب ہو رہا تھا۔ دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں جواب دے رہے تھے۔ کسی نہ کسی طرح اپنی موجودہ حالت پر قابو رکھتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"گریس۔ پیاری گریس۔ آخر یہ کیا مذاق ہے۔ اور میری یہ حالت کیوں ہوتی جا رہی ہے"؟

"بقول تمہارے موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہے۔ درحقیقت اس سگریٹ میں ایک نہایت بے ضرر مگر شدید ترین خواب آور دوا شامل ہے۔ جو چند منٹ میں آپ کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے گی۔ گو آپ خیال میں تھے کہ ہماری ٹرین کہیں راستے میں نہ ٹھہرے گی مگر میں نے پہلے ہی اس کا انتظام کر لیا ہے اور اگلے اسٹیشن پر میرے ملازم کار لئے موجود ہوں گے۔ جہاں سے میں سیدھی نیوبری روانہ ہو جاؤں گی"۔

نیوبری کا نام سنتے ہی مارٹن کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ آنکھیں پھٹ گئیں۔ منہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ زبان لکنت کرنے لگی۔ بمشکل یہ الفاظ ادا ہو سکے۔

"تم .... کیا تم ...... ہائیں ...... ؟"

"جی ہاں میں ہی رانی بٹیالہ ہوں۔ تمہارے والد بزرگوار نے محض اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے جو بدترین قسم کا سلوک میرے ساتھ کیا تھا اُسے میں نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ اور نہ واقعات نے ہی مجھے بھولنے دیا۔ راجہ

پرلے درجہ کا شرابی۔ عیاش اور ظالم تھا۔ لیکن میں نے یہ سب کچھ گوارا کیا۔ اور اُمید پر زندگی کے دن کاٹتی رہی۔ بالآخر راجہ کے ناپاک وجود سے دنیا پاک ہوئی۔ اس وقت میں بالکل مفلس تھی۔ چونکہ میں اپنی نسل۔ مذہب تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے بالکل اجنبی ہی نہیں بلکہ قابلِ نفرت ہستی تھی۔ ایسی صورت میں کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ مجبوراً مجھے چوری کرنا پڑی۔ اور چند نوکروں کو ملا کر بہزار دقت و پریشانی یہاں پہنچی۔ جذبۂ انتقام اب اور زیادہ تیز اور شدید ہو چکا تھا۔ افسوس مسٹر کوونٹ مر چکے تھے۔ اس لئے میں نے کوونٹ برادرس کے فرم ہی کو تباہ و برباد کرنے کا تہیہ کیا۔ اور اس کے ساتھ تمہیں اور ٹام دونوں کو مفلس دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ خواہش بغیر فرم میں داخلہ کے ممکن نہ تھی۔ اس لئے میں نے حساب اور سکریٹری کا کام سیکھا۔ اور بحمداللہ آپ کے دفتر میں داخل ہو گئی۔ یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ ٹام نیک نیت اور ایماندار آدمی ہے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ میں نے اُسے اس کے حصے کی رقم ادا کرنے کے لئے تمہیں آمادہ کیا۔ لیکن تمہاری بے ایمانیاں چالاکیاں اور عیاریاں دیکھ کر میں نے اپنی انتقامی رفتار کو اور تیز کیا۔ اب تم نے دل کھول کر گاہکوں کا روپیہ لٹانا شروع کر دیا۔ میں چاہتی تو تمہیں اس سے باز رکھ سکتی تھی۔ لیکن یہ تمام کام میرے حسبِ منشا انجام پا رہا تھا۔ اس لئے روکنے کے بجائے درپردہ شہ دیتی رہی۔ یہاں تک کہ فرم اور تم اس نتیجہ پر پہنچ گئے۔ اور میری آتشِ انتقام ٹھنڈی ہوئی۔"

ایک بار پھر مارٹن نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی مگر اعضا نے یاوری نہ کی۔ اب دوا اپنا اثر کر چکی تھی۔ گریس نے بآسانی اُسے سیٹ پر لٹا کر اوپر کمبل اڑھا دیا۔ ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ اسٹیشن قریب آتا جا رہا تھا۔ اور گریس اترنے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ اس کے ملازم کار لئے بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

دوسرے دن صبح ادہر مارٹن کو ہوش آیا۔ اور اُدھر حکومت کے محافظین قانون ان کے استقبال کے لئے تیار تھے۔ پابہ جولاں حضرت لندن واپس لائے گئے۔ اور جیل کی کوٹھری میں آباد کر دیئے گئے۔ لیکن نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ اور رانی صاحبہ پٹیالہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ معلوم نہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

* * * * * *

بھیڑیا

الفانسو بہت عجیب و غریب آدمی تھا۔ بلاشبہ وہ جوان تھا۔ متناسب الاعضا تھے۔ جامہ زیب تھا اور انتہائی خوش پوش۔ تاہم یہ محاسن عورتوں کو فریفتہ کرنے کے لئے ایک معینہ اصول قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ لیکن اس کے باوجود الفانسو کے پاس نہیں معلوم کونسا افسوں تھا کہ عورتیں اس کے پاس کھچی چلی آتی تھیں۔ اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اس کے پنجۂ غضب میں آنے کے بعد اس سے خوش رہی ہو۔ بعض کو نہ صرف اس سے اجتناب ہی تھا۔ بلکہ انتہائی نفرت صورت تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک عجیب معمہ تھا کہ وہی عورتیں نہ صرف اس سے ملتی ہی تھیں بلکہ بڑی بڑی رقمیں دیتی تھیں۔ حالانکہ شاید ہر رقم کے ساتھ یہ اطلاع بھی ہوتی تھی کہ یہ قطعی آخری

رقم ہے۔ مگر یہ سلسلہ پھر بھی جاری رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ سونے والی گاڑیوں میں سفر کرتا اور ہر شہر کے بہترین ہوٹلوں میں ٹھہرتا تھا۔ اس نے اپنی شکار زدہ عورتوں کی باقاعدہ فہرست تیار کی تھی۔ جنہیں وہ سونے اور چاندی کی کانیں کہا کرتا تھا۔ ہر شہر میں اپنے پہنچنے کی اطلاع پہلے ہی سے ان عورتوں کو دے دیا کرتا تھا۔ ایسی اطلاع ظاہر ہے ان کے لئے انتہائی روح فرسا اور اذیت رساں ہوتی تھی۔ بعض اوقات انہوں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ اپنے شوہروں سے اپنی اس پُر اسرار زندگی کا انکشاف کر کے ہمیشہ کے لئے اس موذی سے چھٹکارا حاصل کر لیں گی۔ لیکن یہ فیصلہ ایک مذبذب ارادے سے آگے نہ بڑھ سکا اور الفانسو سے ملنے اور معینہ رقم ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

الفانسو کی فہرست میں ایک عورت لندن کی بھی تھی۔ جو نہایت حسین بے حد متین اور سنجیدہ تھی۔ اپنے شوہر سے اس کو بڑی محبت تھی۔ اور میاں بیوی نہایت پُر سکون اور لطف و مسرت سے زندگی بسر کر رہے تھے چونکہ علاوہ شوہر کی آمدنی کے یہ اپنی ذاتی جائداد بھی رکھتی تھی۔ اس لئے وہ غریب بادل نخواستہ الفانسو کو معینہ رقم ادا کرتی رہی اور شوہر کو کوئی شک و شبہ نہ ہو سکا۔ لیکن تابکے۔ آخری قسط ادا کرتے ہوئے اس نے کہدیا کہ بس یہ آخری قسط ہے۔ اب کسی مزید رقم کی توقع نہ رکھی جائے۔ الفانسو نے حسبِ معمول یہ تحریر زیر لب مسکراتے ہوتے ردی کی ٹوکری میں ڈالدی۔ اور ستمبر کے مہینہ کا منتظر رہا۔ جب کہ قسط واجب الادا ہوتی تھی۔ ستمبر آیا۔

مگر رقم نہ آئی۔ اکتوبر بھی آیا اور گزر گیا۔ لیکن رقم کا پتہ نہ تھا۔ حتیٰ کہ نومبر بھی ختم ہو گیا۔ اور رقم غائب تھی۔ سمجھ گیا۔ کہ بغیر لندن جاتے معاملہ نہ بنے گا۔ مگر دسمبر میں لندن کا موسم چونکہ نہایت افسردہ اور بے کیف ہوتا ہے اِس لئے مصر کی روح پرور فضا چھوڑنا بڑی کلفت کی بات تھی۔ تاہم کام بہر حال کام ہوتا ہے، اس میں تکلیف و راحت کا سوال کاہلوں کا اصول ہے۔

الفانسو نے اپنے معیّنہ اصول کے بموجب اپنی آمد کی اطلاع دے دی۔ لیکن اسے حسنِ اتفاق کہیئے یا سوءِ اتفاق یہ خط لندن اُس وقت پہنچا جبکہ مکتوب الیہ اپنی ایک عزیزہ سے ملنے امریکہ جا چکی تھی۔ اور چونکہ ابتدائی حروف میاں بیوی کے ایک ہی تھے اس لئے شوہر نے نادانستگی میں یہ خط کھول لیا۔ اور کئی بار پڑھا۔ وہ ایک جہاندیدہ آدمی تھا احمق نہ تھا۔ سارا راز اچھی طرح سمجھ گیا۔ اور بجائے اس کے کہ اس کو بیوی کی طرف سے کسی قسم کی نفرت یا شکایت ہوتی اُس نے فیصلہ کیا کہ قبل شادی کے جو کچھ ہوا ہو در حقیقت اس کی ذمہ دار بیوی تھی۔ اور اب جو کچھ ہوگا اس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ لہٰذا وہ فوراً پیرس پہنچا اور مخصوص ذرائع سے الفانسو کے تفصیلی حالات کا پتہ لگا کر لندن واپس آگیا۔

اس طرف الفانسو نے لندن پہنچ کر ٹیلیفون کیا۔ جواب ملا۔ اس وقت مکان پر نہیں ہیں۔ اس کے بعد الفانسو کو ایک ٹائپ شدہ تحریر ملی جس میں ملاقات کا تعیّن اور رازداری کی استدعا کی گئی تھی۔ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ چونکہ وقت معیّنہ میں دو روز کا وقفہ تھا۔ اس لئے یہ وقت

اُس نے سیر و تفریح میں بسر کیا۔ ایک نئی کار خریدلی۔ اس کے پیرس روانہ کرنے کا انتظام کیا۔ بعد ہوٹل میں مکمل آرام کرتا رہا۔

وقت معینہ پر مسٹر الفانسو عودت کے مکان پہنچے۔ گھنٹی بجائی اور اندر بلالئے گئے۔ جہاں ان کے استقبال کی مختصر روئداد یہ ہے کہ جناب نے بغیر کسی جد وجہد کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دونوں پستول۔ جن کو وہ ہر وقت لئے پھرتے تھے۔ مد مقابل کے حوالے کر دیئے۔

بڑے دن کی صبح کو آٹھ بجے سپرنٹنڈنٹ او کنگٹن کو اپنے بستر سے اٹھ کر حسب ذیل واقعہ ٹیلیفون پر سننا پڑا۔

ایک دودھ والا جب کہ علی الصباح اپنی کار میں گاہکوں کو دودھ تقسیم کر رہا تھا اس نے چاپ ہنم چوراہے کے نزدیک سڑک کے کنارے ایک نئی گاڑی دیکھی جو غالباً غروب آفتاب کے بعد وہاں کھڑی تھی۔ کیونکہ اُس کی چھت پر تین انچ کے قریب برف جمی ہوئی تھی۔ اس کے لئے یہ نہ صرف عجیب بلکہ مشتبہ بات تھی۔ لہذا وہ اپنی کار سے باہر آکر اس گاڑی کے قریب گیا اور دیکھا کہ ایک آدمی گاڑی کے پیچھے اوندھے مُنہ مردہ پڑا ہے اور ایک ہاتھ میں پستول پکڑے ہوئے ہے۔ اس لاش کے قریب ہی ایک دوسرے آدمی کی لاش بھی ہے جس کا مُنہ برف سے چھپا ہوا ہے۔ یہ منظر دیکھتے ہی دودھ والے نے فوراً قریبی پولیس اسٹیشن پہنچ کر تمام واقعہ کی اطلاع دے دی۔

ایک گھنٹہ کے اندر اندر سپرنٹنڈنٹ اوکنگٹن معہ ایک درجن پولیس

والوں کے موقع واردات پر پہنچ گئے۔ لیکن سارا دن سر کھپانے کے باوجود سوائے چند اصولی اور سرسری باتوں کے کسی ایسے سراغ کا پتہ نہ چل سکا۔ جس سے قتل کا سبب اور قاتل کا پتہ لگ سکتا۔ آخر کار ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اوکنگٹن نے شام کو آرچی لینٹن کو ٹیلیفون کیا۔

آرچی لنٹن اپنے پیشہ کے اعتبار سے تو ایک وکیل تھا اور نہایت کامیاب وکیل۔ مگر اپنی فطری ذہانت۔ تیز طبعی اور ہوشیاری نے اُسے ایک کامیاب سراغرساں بھی بنا رکھا تھا۔ خصوصاً سپرنٹنڈنٹ اس کا بے حد معتقد تھا۔ جب کبھی کوئی پیچیدہ معاملہ پڑا۔ جسے سلجھانے میں اس کا دماغ قاصر رہا۔ اس نے ہمیشہ لنٹن سے رجوع کیا۔ جس نے فوراً اس کا حل تلاش کر دیا۔ لنٹن نے اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اوکنگٹن سے کہا۔

"کہئے آپ نے اس وقت کیا کیا پتہ لگایا؟"

"ایک مقتول" اوکنگٹن نے جواب دیا "غیر ملکی۔ غالباً ارجنٹائن کا باشندہ ہے۔ پیرس میں رہتا ہے۔ ایک ہفتہ کے قریب ہوا یہاں آیا ہوا تھا۔"

"خوش حال تھا؟"

"بہت خوشحال۔ دو سو پونڈ کے نوٹ تو جیب سے برآمد ہوتے۔ نیدرلینڈ ہوٹل میں قیام تھا۔ گذشتہ جمعہ کو بارہ سو پونڈ کی ایک نئی کار خریدی تھی۔ جو اس کی لاش کے پاس کھڑی ہوئی پائی گئی۔ ہم نے پیرس بھی فون کیا۔ جہاں پولیس نے اس کے فلیٹ کی تلاشی لی۔ مگر کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ملی۔ پولیس کا خیال ہے کہ اس کا ذریعہ معاش بلیک میلنگ تھا۔"

"کے گولیاں چلائی گئیں"؟

"صرف ایک۔ عین قلب پر"۔

"تم نے یہ بھی کہا تھا کہ ایک دوسرا آدمی بھی قتل ہوا ہے"۔

"ہاں۔ وہ بھی اسی طرح مارا گیا ہے۔ کار میں کچھ خون کا نشان ملتا ہے۔ علاوہ اس کے کوئی سراغ نہیں"۔

"یہ دوسرا آدمی کون ہے۔ کچھ پتہ چلا"؟ لنٹن نے پوچھا

"یہ بڑے مزے کی بات ہے"۔ اوکلگٹن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ شخص آپکا دیرینہ شناسا ہے"۔

"میرا شناسا"؟ لنٹن نے بڑے متحیر لہجہ میں کہا۔

"جو اسٹیکٹ۔ جسے آپ نے پھانسی کے تختہ سے بچایا تھا۔ یہ شخص موٹر کار سرقہ کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ ہم لوگ خود اس کی تلاش میں تھے۔ ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا کہ جیل سے رہا ہوا ہے۔ اور کل صبح اُس نے ایک کار پر حملہ کر دیا۔ لیکن پیچھا کرنے پر وہ کار چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کل شام کو بھی ایک موٹر چرانے کی کوشش کی۔ مگر اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اور پولیس کے تعاقب سے صاف نکل گیا۔ بس اُس کے بعد پتہ نہ چل سکا"۔

"تب تو معاملہ صاف معلوم ہوتا ہے"۔ لنٹن نے سوچتے ہوئے کہا۔ بظاہر یہ کار بھی اُس نے چرانے کی کوشش کی ہوگی۔ اتفاقیہ مالک کہیں پاس ہی ہوگا وہ چلتی ہوئی کار میں فٹ بورڈ پر چڑھ گیا ہوگا۔ اور اسٹیکٹ نے اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا ہوگا"۔

"جی نہیں" ، اوکنگٹن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اول تو اس کے پاس ریوالور کہاں سے آیا۔ اور پھر ایسا ریوالور جو یہاں دستیاب نہیں ہوتا۔ دوسرے اس کی جیب سے پچاس پونڈ کے نوٹ بھی نکلے۔ جن کے نمبر الفانسو کے نوٹوں سے مطابقت کرتے ہیں۔ اس لئے یہ یقینی ہے کہ یہ رقم الفانسو نے اُسے خود حوالے کی۔ اور اگر اسٹیکٹ خود چھُڑاتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ کل رقم نہ ساد کرتا۔"

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی۔ کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بولی اور کئی منٹ تک اوکنگٹن کسی سے بات چیت کرتا رہا۔

"ابھی ابھی ایک میرے افسر نے بتایا ہے کہ الفانسو کی کار کل رات کو گرین لان کے پاس بھی کھڑی ہوئی دیکھی گئی تھی۔ میرے خیال میں اگر زحمت نہ ہو تو چلئے یہ جگہ بھی دیکھ آئیں۔"

جب یہ دونوں گرین لان پہنچے تو دو خفیہ پولیس کے آدمی پہلے سے موجود تھے۔ معلوم ہوا جس مکان کے سامنے کار دیکھی گئی تھی وہ دراصل خالی تھا اور دو بیوہ اور نہایت معزز عورتوں کی ملکیت تھی۔ یہ لوگ کسی دیہات میں منتقل ہو گئیں تھیں اور یہ مکان برائے فروخت کسی دلّال کے سپرد تھا ایسے خالی مکان کے سامنے کار کی موجودگی نے پوسٹ مین کو مشکوک کیا۔ مکان کے ابتدائی حصہ میں کوئی چیز مشتبہ نہیں ملی۔ البتہ عقبی حصہ کے ایک کمرے میں جرم کے نشانات موجود تھے۔ اور فرش پر کافی خون موجود تھا۔ اور کاغذات کی جلی ہوئی راکھ بھی موجود تھی۔ لنٹن نے بہت

احتیاط سے تھوڑی سی راکھ اٹھا کر بغور دیکھا۔

"بہت احتیاط اور ہوشیاری سے کاغذات کو جلایا گیا ہے۔ حروف کا خفیف ترین نشان بھی نہیں ملتا"۔

جب کہ اس کمرے میں تحقیقات کا سلسلہ جاری تھا۔ دوسرے آدمی نے آکر اطلاع دی کہ باورچی خانہ کی ایک کھڑکی بظاہر کسی اوزار سے کھولی گئی ہے۔ اور اس کے پاس والی میز پر کیچڑ سے بھرا ہوا ایک بھدا سا نشان ہے جسے نہایت بھونڈے پن سے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کھڑکی کے باہر ایک مختصر باغ ہے۔ اور پھر راستہ جس کے ذریعے کوئی آدمی نہایت خاموشی سے مکان میں آجا سکتا ہے۔

"مگر سوال یہ ہے کہ جب پولیس اسٹیکٹ کا تعاقب کر رہی تھی۔ تو وہ اس مکان میں کیوں اور کیسے پہنچ گیا۔ اسٹیکٹ کی کار اس مکان سے تخمیناً دو سو گز کی دوری پر کھڑی ہوئی پائی گئی۔ جس سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ مکان میں چوری کی غرض سے آیا تھا اور یہاں خلاف توقع الفانسو سے مڈبھیڑ ہو گئی"۔

لنٹی نے طعنہ زنی سے ہنستے ہوتے کہا۔

"میں اس سے بہتر حل اس جرم کا دے سکتا ہوں"۔

اور واقعی اس رات کا بیشتر حصہ لنٹی نے تفصیلی طور پر اپنا حل لکھنے میں صرف کیا۔ لنٹی کی یہ رپورٹ آج تک اسکاٹ لینڈ یارڈ کے دفتر میں محفوظ ہے اور اور وہاں کے سربرآوردہ افسران کی نظروں میں اس کی صداقت انجیل مقدس

سے کم نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن اس کے باوجود اس جرم کی حقیقت جس کا ارتکاب ۲۴ر دسمبر کی رات کو ہوا۔ بالکل مختلف تھی۔

× × × × × ×

لندن اپنی آب و ہوا اور موسم کے لحاظ سے دسمبر اور جنوری میں بے حد غیر دلچسپ اور بے کیف ہوتا ہے۔ لیکن جب لوگوں کے قلوب میں عیش و مسرت کی موجیں اٹھتی ہیں۔ تو خرابیٔ موسم وغیرہ کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اور لطف و مسرت کی تقاریب پوری شادمانی اور عیش سے منائی جاتی ہیں۔ اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ ۲۴ر دسمبر کی رات لندن میں کیسی ہوگی۔ تمام بازاریں اپنی پوری زیب و زینت کے ساتھ کھلی ہوئی تھیں۔ دوکانیں بقعۂ نور ہو رہی تھیں۔ لوگوں کے ہجوم سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ انسانوں کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈا چلا آرہا تھا۔ اور ہر شخص کل بڑے دن کے لئے تحائف اور ضروریات خریدنے میں مصروف تھا۔ اور بڑے تجربہ کار اور جغادری قسم کے جرائم پیشہ لوگوں کے واسطے یہ مواقع بڑے زریں ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسٹیکٹ ایسے مجرم یہ موقع ضائع کر دیتے بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ آپ اپنی نہایت بوسیدہ اور دقیانوسی کار میں کئی گھنٹوں سے شہر کے مختلف حصوں میں چکر لگا رہے تھے مگر کہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے آپ کو بار بار غصہ آرہا تھا۔ اسی عالمِ غیظ و غضب میں آپ نے ایک سڑک کو پار کرنا چاہا۔ اول تو اس قدر انبوہ۔ دوسرے بارش کی وجہ سے ہر طرف کیچڑ اور پانی۔ لیکن ان باتوں کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے آپ نے کار موڑ ہی

دی۔ ابھی سڑک کا کچھ حصہ طے ہوا تھا کہ ایک طرف سے ٹرام اور دوسری طرف سے ایک موٹر آگیا۔ ٹرام سے کسی نہ کسی طرح اپنی کار کو بچاتے اور موٹر سے ہلکی سی ٹکر لیتے ہوتے آگے بڑھے تھے کہ شامت کا مارا ایک خوانچہ والا سامنے آگیا۔ دماغ کا توازن تو بگڑا ہی تھا اب کار کا توازن بھی قابو سے باہر ہوگیا۔ ایک دھڑاکا ہوا اور ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی۔ پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں۔ مگر بھلا اسٹیکٹ صاحب اس کی کب پروا کرتے ہیں۔ فوراً ایک ایسی سڑک پر کار موڑ دی گئی جو نسبتاً تاریک اور جہاں مجمع کم تھا۔ پولیس والوں نے اب تعاقب شروع کر دیا۔ انہوں نے بھی اپنے چھکڑے کی رفتار میں اضافہ کیا۔ بہا بہت شدت سے ریس ہونے لگی۔ لیکن مقابلہ کسی نو مشق یا نا تجربہ کار سے نہ تھا۔ بلکہ اسٹیکٹ ایسے خرانٹ اور چھٹے ہوئے بدمعاش سے تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ پولیس کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتی اور عنقریب شکست کا اندیشہ ہے۔ حضرت نے جھکائی دینے کے لئے کبھی داہنی اور کبھی بائیں طرف کی سڑکوں پر کار موڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بالکل سنسان سڑک پر پہنچ گیا۔ اندھیری رات تو تھی ہی اور اس پر گھٹا ٹوپ بادل۔ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ اسٹیکٹ نے کار کو سڑک کے کنارے کھڑا کر کے انجن بند کر دیا۔ اور خاموشی سے پولیس والوں کا انتظار کرنے لگا۔ جب دیر تک موٹر سائیکل یا سیٹی کی آواز نہ سنائی دی تو مطمئن ہو کر موٹر سے باہر آگیا۔ اور یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ وہ کہاں اور کس سڑک پر ہے۔ دبے پاؤں مکانات کو بغور دیکھتا ہوا ایک طرف چلنے

لگا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ کسی موٹر کے پشت کی سُرخ روشنی نظر آئی۔ نہایت خاموش چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ موٹر کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ اور قریب پہنچا۔ ڈرائیور کی نشست کا دروازہ ضرور کھلا تھا۔ لیکن ڈرائیور نہیں تھا۔ موٹر کو بغور دیکھا معلوم ہوا بالکل نیا تھا۔ مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اب کرسمس ضرور ٹھاٹھ سے منایا جائے گا۔ انجن تو چل ہی رہا تھا۔ چپکے سے ڈرائیور کی جگہ پر جم کر بیٹھ گیا۔ خفیف سے اشارے میں کار رینگنے لگی۔ اور تھوڑی دیر میں مسٹر اسٹیکٹ نیچے سُروں میں ایک نغمہ گنگناتے ہوئے پوری رفتار سے جارہے تھے۔ موٹر چرانے والوں کا یہ متفقہ اصول ہے کہ مسروقہ کار کو جتنی جلد ممکن ہو شہری پولیس کے حدود سے باہر کردیا جاتے۔ چنانچہ اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسٹیکٹ نے لندن سے باہر جانے والی سڑک کا رُخ کیا۔ ابھی سڑک کافی دور ی پر تھی کہ جناب کی گدی میں کوئی ٹھنڈی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اندھیر میں کار کے اندر بیٹھتے ہوتے اسٹیکٹ نے یہ اندازہ کیا تھا کہ پچھلی اور ڈرائیور کی نشست کے درمیان ایک کھڑکی ہے۔ اس لئے خیال ہوا کہ شاید اس کا پٹ کھلا رہ گیا ہے۔ اور گدی میں لگ رہا ہے۔ بے ساختگی کے انداز میں آپ نے ایک ہاتھ سے اس پٹ کو بند کرنا چاہا۔ مگر ....

"خبردار کسی طرف کار کو نہ موڑنا ورنہ سارا چھیچا حلق میں اتار دوں گا۔ بس سیدھے چلے چلو۔"

حالانکہ اسٹیکٹ کی ساری عمر مجرمانہ دشت ہی کی سیاحی میں گزری تھی۔ بڑے بڑے معرکوں کا نہایت دلیری اور جرأت سے مقابلہ کرچکا تھا۔ تاہم یہ چیز اس

قدر غیر متوقع اور اچانک تھی کہ اس کے حواس جاتے رہے۔ سارے جسم میں رعشہ ہونے لگا۔ اور پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ نہایت پُر لطف خواب سے کسی بھیانک اور ڈراؤنی آواز نے یکایک بیدار کر دیا۔ اس گڑبڑ میں کار بھی بے قابو ہو گئی۔ کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر جانے لگی۔ پھر پُراسرار آواز سنائی دی۔

"میں کہتا ہوں۔ سیدھے چلے چلو۔ اور پورٹ ماؤتھ پہنچ کر ڈوے برج کی طرف گھوم جانا۔ اور اگر تم نے درمیان میں روکنے کی کوشش کی تو جہنم داصل کر دوں گا۔ سمجھ میں آیا"۔

ابھی تک اسٹیکٹ پر اس درجہ خوف طاری تھا کہ غریب کی زبان سے "ہاں" کا لفظ بھی نہ نکل سکا۔ نہایت سراسیمگی کے عالم میں کئی بار صورت اثبات اُس نے سر ہلا دیا۔ ایک موڑ پر پہنچ کر پھر آواز آئی۔

"بیدرہیڈ کی طرف موڑ دو"۔

اب کار بالکل سنسان اور غیر آباد مقام پر پہنچ چکی تھی۔ پھر کسی نے ہدایت دی۔

"بس سڑک کے بائیں جانب کر کے بالکل روک لو"۔

کار کے رکتے ہی ایک آدمی پچھلی سیٹ سے باہر نکل آیا۔ اور ڈرائیور کی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"باہر آجاؤ۔ کیا تمہارے پاس ریوالور ہے"۔

"جی نہیں۔ میں کبھی ریوالور نہیں رکھتا"۔

اس دوران گفتگو میں اجنبی نے نہایت تیز ٹارچ کی روشنی اسٹیکٹ کے مُنہ پر ڈالے رکھی۔ جس کی وجہ سے وہ اجنبی کو بالکل نہ دیکھ سکا۔ ہنستے ہوئے پُراسرار آدمی نے کہا۔

"اس کو حُسنِ اتفاق کہنا چاہیئے۔ یا مشیت ایزدی۔ خیر، پچھلی سیٹ پر دیکھو کیا ہے"۔

اب اسٹیکٹ کسی قدر حواس پر قابو پا چکا تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں اُسے قدرے پس و پیش ہوا۔ لیکن ایک قوی ہاتھ نے اُسے پچھلی سیٹ کی طرف دھکیل دیا۔ اور ساتھ ہی اجنبی کے داہنے ہاتھ میں ایک ریوالور دکھائی دیا۔ مجبوراً اسٹیکٹ نے کار کے اندر جھانک کر دیکھا۔ ایک شخص بہت بے ہنگم انداز میں سیٹ پر دراز تھا۔ اور ایک بائیسکل زبردستی ٹھونس کر رکھی ہوئی تھی۔ اجنبی تحکمانہ انداز میں بولا۔

اس آدمی کو باہر نکال لو۔ ڈرو نہیں۔ یہ بالکل مُردہ ہے"۔

طوعاً وکرہاً اسٹیکٹ نے لاش کو باہر نکالا۔ اور خاموشی سے دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ اجنبی نے ٹارچ کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے بائیسکل اور لاش کو کار میں رکھا ہی تھا کہ تم آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ دوبارہ مکان میں جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ کار کے اندر ہی دبک رہا۔ اور خیال کیا تم راہگیر ہو۔ سیدھے چلے جاؤ گے۔ لیکن جب تم نے کار کو چلانا شروع کیا۔ تو میں سمجھ گیا کہ تم کس قماش کے آدمی ہو۔ تمہارا کیا نام ہے"۔

"جو اسٹیکٹ"!

"کون۔ جو اسٹیکٹ۔ کیا تم مجھے پہچانتے ہو۔ یاد کرو۔ میں نے تم کو اکزیٹر میں پھانسی سے بچایا تھا۔ جب کہ تم نے ایک غریب بڑھیا کو چند تانبے پیسوں کے واسطے ہتوڑا مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اور تم اپنے رہا ہونے سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن میں نے شہادت میں ایک کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہیں صاف بچا لیا"

بہت متحیر لہجے میں اسٹیکٹ بولا۔

"اچھا۔ آپ مسٹر لنٹن ہیں۔ پناہ بخدا۔ یہ سب کیا قصہ ہے"

لنٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھک کر مردہ آدمی کی جیب سے نوٹوں کا بٹوہ نکالا۔ اور اطمینان سے گن کر پچاس پونڈ کے نوٹ اسٹیکٹ کو دے کر بقیہ نوٹ پھر مردے کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اسے جیب میں احتیاط سے رکھ لو۔ اور ایک مرتبہ تو تم زندگی سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ اگر پھر ایک موقع ایسا ہی آجائے۔ تو کیا مضائقہ ہے۔ بہر حال مرنا تو ہے ہی۔ اور درحقیقت اس کے لئے تم نے اپنے آپ کو خود ہی پیش کیا ہے"

"میں اس کا مطلب ...."

ابھی جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا۔ کہ ایک باریک سا شعلہ لنٹن کے ہاتھ سے نکلا۔ تڑاق سے آواز ہوئی اور اسٹیکٹ زمین پر آرہا۔ لنٹن نے بہت اطمینان سے ریوالور کھولکر دیکھا۔ اور بند کرکے پہلی لاش کے قریب رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے اسٹیکٹ کی لاش کو گھسیٹ کر چند گز کے

فاصلہ پر ڈال دیا۔ اور ایک دوسرا ریوالور جیب سے نکال کر اسٹیکٹ کے داہنے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اب اُس نے کار سے سائیکل نکالی۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح ہونے کے قریب تھی اور گرجا کے گھنٹے بڑے دن کی خوشی میں بج رہے تھے۔ کہ لنٹن مکان میں داخل ہوا۔ ایک تار میز پر رکھا ہوا تھا۔ جس میں اس کی محبوب بیوی نے امریکہ سے اس کو مبارک باد دی تھی۔

"پیارے شوہر بڑا دن مبارک ہو۔"

※ ※ ※ ※ ※ ※

ملتان آفریدی

بڈھے شیر خاں کو قصہ گوئی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ اس کا اندازِ بیان بے حد دلچسپ اور لب و لہجہ میں خاص کشش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب کبھی ہمارا کیمپ اس کے گاؤں کے نزدیک لگایا جاتا میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا۔ اور اُسے خود بھی مجھ سے اُنس ہو گیا تھا۔ یہ غیر ممکن تھا کہ ہمارا کیمپ وہاں لگے۔ اور شیر خاں مجھ سے ملنے نہ آئے۔

یوں تو شیر خاں کا ہر افسانہ اپنی نوعیت اور دلچسپی کے اعتبار سے دلکش ہوتا ہی تھا۔ جن میں اکثر صحیح واقعات اور اس کے چشم دید حالات ہوتے تھے۔ لیکن اس کی ایک کہانی اپنے اندر عجیب جاذبیت رکھتی تھی۔ جسے میں بار بار سننے کے لئے مجبور تھا۔ واللہ اعلم وہ صحیح تھی یا من گھڑت۔ لیکن خود شیر خاں کا لہجہ بھی اس کو بیان کرتے ہوئے بدل جاتا تھا۔ اس قصہ کی

فرمائش پر اُسے بیان کرنے میں بے حد پس و پیش ہوتا۔ جب میرا اصرار اُس کے انکار پر غالب آ جاتا۔ تو اُسے بادل ناخواستہ وہ شروع کرتا۔ مگر ساتھ ہی اس کی ساری شگفتگی ختم ہو جاتی۔ آواز میں درد پیدا ہو جاتا۔ میرے پیہم اصرار پر وہ چند منٹ کے واسطے ساکت ہو جاتا۔ آنکھیں پُر نم ہو جاتیں۔ اور چہرے کا رنگ متغیّر ہو جاتا۔ نیم بیہوشی کی کیفیت میں وہ تھوڑی دیر کو یہ بھی بھول جاتا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے مخاطب کرنے پر وہ یکایک چونک پڑتا۔ اور نہایت گلوگیر آواز سے اس مخصوص کہانی کو اس طرح شروع کرتا:۔

× × × ×

بہت عرصہ ہُوا آفریدی خاندان کا ایک فرد انور خاں کے یہاں لڑکا پیدا ہُوا۔ چونکہ یہ پہلی اولاد تھی۔ اس لئے قدرتاً نوعمر والدین کو اس سے بے حد محبّت اور اُنس تھا۔ لڑکا بھی بے حد شکیل اور تندرست تھا۔ جب اس کی ماں اسے گود میں لیتی تو اس کی مسرت خیز نگاہیں پہروں اس کے چہرے سے نہ ہٹتیں۔ وفورِ محبت میں کبھی پیار کرتی اور کبھی سینہ سے لگاتی۔ ماں باپ نے اس لڑکے کا نام ملتان رکھا۔

خاندانی جھگڑے جن میں جان لینا اور جان دینا بچوّں کا کھیل تھا۔ اس زمانہ کے مقابلے میں اس وقت بہت زیادہ تھے۔ انسانی خون بے حد ارزاں تھا۔ اور اس قسم کے خونی حالات اکثر ملتان کے والدین کو پہاڑوں میں روپوش ہونے کے لئے مجبور کرتے تھے۔ کچھ دن بعد وہ پھر اپنے گاؤں واپس آتے اور اس وقت بظاہر پُر سکون زندگی بسر کرتے جب تک کہ پھر انہیں

اپنی اور اپنے عزیز بچے کی زندگی خطرے میں نہ دکھائی دیتی۔ ظاہر ہے کہ اس انداز کی زندگی بڑی دشوار اور کٹھن زندگی تھی۔

اسی طرح دن گزرتے گئے یہاں تک کہ ملتان بیس سال کا ہو گیا۔ اب وہ ایک شکیل اور تندرست نوجوان تھا۔ اس کی رگوں میں اگر ایک طرف تازہ خون گردش کر رہا تھا تو دوسری طرف دنیا اور اس کی رنگینیاں دیکھنے کا ایک جذبۂ بے پناہ اس کے قلب میں موجزن تھا۔ وہ پاس پڑوس والوں سے انگریزوں ان کی عورتوں، فوج اور شہر کی دلچسپیوں کے حالات سنتا چلا آ رہا تھا۔ جن کے تصور نے اکثر اس کی پرسکون راتیں برباد کی تھیں۔ بالآخر وہ وقت آ ہی گیا۔ جب کہ اس نے قلبی خواہشوں کو عملی طور پر پورا کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ظاہر ہے۔ کہ ملتان کے والدین کو اس کی مفارقت کسی طرح گوارا نہ تھی۔ مگر اولاد اور ایک چہیتی اولاد کی خواہش کو نظرانداز کرنا بھی ان کے بس کی بات نہ تھی۔ بادل ناخواستہ انہیں اجازت دینا ہی پڑی۔

ملتان نہیں معلوم کن کن دشواریوں اور تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا پا پیادہ پشاور پہنچا۔ جہاں کی چہل پہل۔ نئی نئی صورتیں۔ عالیشان مکانات اور ہر طرف ایک مختلف زندگی دیکھ کر وہ مبہوت ہو گیا۔ اُسے ان تمام مشاہدات پر ایک پر کیف خواب کا دھوکا ہو رہا تھا۔ چند دن محض اس نے گھومنے پھرنے اور سیر و تفریح میں بسر کئے۔ اور جب اس سے جی بھر گیا اور جیب بھی خالی ہونے لگی تو وہ ایک مقامی پیدل فوج میں بھرتی ہو گیا۔

جوانی اوّل تو دیوانی ہوتی ہے۔ اور دوسرے فوج کی آزاد زندگی اور اسی قسم

کے احباب کی صحبت نے ملتان کے لئے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اور ایک طوائف کے یہاں اس کی آمد و رفت ہونے لگی۔ عورت بھی نہایت حسین و جمیل تھی اور پھر طوائف ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ملتان کو اُس سے بے انداز محبت ہو گئی اور پوری طرح اس کی گرفت میں آگیا۔ اپنی ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی سے یہ بھی یقین کرنے لگا کہ وہ بھی اُس کو اتنا ہی عزیز رکھتی ہے۔ مگر جذبات میں تصنع اور بناوٹ زیادہ عرصہ تک کامیاب نہیں ہوتی۔ اور جب ملتان نے دیکھا کہ اس کی ساری تنخواہ اور دوست احباب کا قرض بھی اس کی محبوبہ کے واسطے ناکافی ہوتا ہے۔ بلکہ روزانہ اس کی فرمائشات میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے تو اُس کی آنکھ کھُلی۔ سمجھ گیا۔ کہ اس عورت کو مجھ سے کہیں زیادہ روپیہ سے محبّت ہے۔ چنانچہ ایک دن ملتان کو اس کے پیہم تقاضوں نے دیوانہ بنا دیا۔ مجنونانہ انداز میں وہ سیدھا سرکاری خزانہ پہنچا۔ سنتری کو ہلاک کیا۔ ایک کافی رقم نکال لی اور طوائف کے یہاں واپس آکر اُس کے حوالے کر دی۔ فوج میں واپس جانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اور حقیقتاً اسے اب طوائف سے بھی کوئی لگاؤ نہ رہا تھا۔ وہ صرف چندے اس کی پناہ میں رہ کر ایک دن زندہ و سلامت اپنے وطن پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں اُسے یقین تھا کہ وہ ہر طرح محفوظ ہو جائے گا۔ سرکاری خزانہ میں اتنے اہم حادثہ کا ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ فوراً پولیس نے چھان بین شروع کر دی۔ اور جب کوئی سراغ نہ لگا تو قاتل کی گرفتاری کے لئے ایک زبردست انعام کا اعلان کیا گیا۔ طوائف کو ملتان کے اپنے یہاں مسلسل قیام پر پہلے ہی

شبہ تھا۔ لیکن خزانہ میں قتل و غارت کی شہرت اور انعام کے اعلان نے اِس شبُہ کو یقین میں بدل دیا۔ اس بندۂ زر نے ایک رات خفیہ طور پر حکام متعلقہ کو اطلاع دے دی کہ شاہی مجُرم اس کے پاس مُوجود ہے فوراً فوج کے ایک دستہ نے طوائف کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اور احتیاط کے ساتھ مکان کے نزدیک پہنچنے لگے۔ بغیر ملتان کو اطلاع کئے طوائف کا یکایک اور وہ بھی رات کو مکان سے غائب ہونا ملتان کے لئے حیرت انگیز تھا۔ اس کو خیال ہُوا ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ واپسی پر ملتان کے سوالات کے جواب بھی انتہائی مشکوک اور مشتبہ دئے گئے۔ جس نے اس کے شبہات کو اور زیادہ قوی کر دیا۔ یقین ہو گیا خطرہ بالکل نزدیک ہے۔ اور فوراً ہی اگر بچاؤ کی آخری اور امکانی صورت اختیار نہ کی گئی تو جان سلامت لے جانا محال ہے۔ طوائف ہنوز سامنے موجود تھی۔ ملتان نے محبت کے انداز میں ایک ہاتھ سے اُسے آغوش میں لے لیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے چھرا نکال کر اس کے سینہ میں پیوست کر دیا۔ ایک ہلکی سی کراہ اور خفیف سے تشنج کے بعد طوائف ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ اس طرف سے فرصت پا کر بغیر ایک لمحہ ضائع کئے ملتان اپنی رائفل اور بگل لے کر چھت پر چڑھ گیا۔ اور حملہ کی موقوفی کا بگل بجا دیا۔ جب فوجی دستہ بگل کے قریب میں آ کر واپس ہو گیا۔ تو ملتان چپکے سے باہر نکلا اور ایسی پُر فریب اور پُر خطر رنگینیوں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر اپنے وطن کی طرف چل دیا۔ جہاں کا ذرہ ذرہ اِس کے لئے چشم براہ واپسی کی دعوت دے رہا تھا ؎

ساس

للّی کی ساس بھی دنیا اور خصوصاً ہندوستان کی دوسری ساسوں سے کسی طرح مستثنےٰ نہ تھی۔ صبح سے شام تک وہی دانتا کل کل۔ وہی بات بات پر اعتراض، اور وہی ہنگامہ آرائی جو ساس بہو والے گھروں کی رونق سمجھی جاتی ہے۔ یہاں بھی موجود تھی۔ للّی غریب اگر صبح اٹھے تو خرابی کہ خود نہیں سو سکتی تو مردار دوسروں کی نیند کیوں حرام کرتی ہے۔ اور اگر ساس کے بیدار ہونے کے بعد اُٹھے تو مشکل کہ منحوس نہیں معلوم کس کم بخت کی اولاد ہے جو بارہ بجے تک بستر پہ سانڈنی کی طرح اینڈا کرتی ہے۔ غرضیکہ للّی کی زندگی حسب معمول دوسری بہوؤں کی طرح ایک مستقل عذاب تھی جس سے چھٹکارا سوائے تائید غیبی کے بظاہر ممکن نہ تھا۔ کیونکہ للّی کا شوہر بلدیو بھی۔ جس سے تھوڑی بہت امید ہو سکتی تھی۔ ہندوستان کے دوسرے سپوت بیٹوں کی طرح ساس

بہو کے معاملہ سے بالکل غیر متعلق اور غیر جانب دار رہنے ہی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھا۔ اور ہندوستانی رواج کے بموجب اپنی ماں کا احترام اور تقدس پوری طرح اس کے دل میں موجود تھا۔ انسانی خاصہ ہے کہ جب کسی مصیبت یا پریشانی میں نجات پانے کی کوئی امید باقی نہیں رہتی اور تمام سہارے ٹوٹ جاتے ہیں۔ تو اطمینان اور سکون کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کہ یہ شخص کسی اذیت میں مبتلا ہے۔ چنانچہ یہی صورت للّی کی ہوئی۔ ابتدا میں ضرور ساس کا یہ سلوک اس کی افسردگی اور ملال کا سبب ہوا۔ لیکن جب یہ چیز اس کی زندگی کا ایک اٹل اصول بن گیا۔ اور شوہر کے دامن محبت میں بھی پناہ کا کوئی سہارا نظر نہ آیا۔ تو وہ بالکل مطمئن ہو گئی۔ ساس کی اب کوئی بدسلوکی۔ کسی قسم کی بدمزاجی۔ اور ہر طرح کا اعتراض للّی کے واسطے قابلِ توجہ نہ تھا۔ وہ صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک ہر قسم کا کام پوری مستعدی اور انہماک سے انجام دیتی اور ساس کے ہر اعتراض کو خاموشی سے ایک کان سنتی اور دوسرے سے نکال دیتی۔ علاوہ اور کاموں کے للّی کے ذمہ روزانہ پانی لانا بھی تھا۔ دن میں کم از کم دو بار۔ اور کبھی تین بار۔ حالانکہ یہ کام ایک گونہ وقت طلب تھا۔ کیونکہ پہاڑی کے ڈھلوان اور تنگ راستہ سے گزر کر اُسے جھیل سے پانی لانا پڑتا تھا۔ لیکن وہ اس فریضہ کو بڑی خوشی اور مسرت سے انجام دیتی۔ اوّل تو اس لئے کہ پہاڑی کی بلندی سے وہ روزانہ اپنے آبائی گاؤں کو ایک نظر دیکھ لیا کرتی تھی۔ جو دوسری ملی ہوئی پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ دوسرے ہفتہ میں دو ایک مرتبہ اُسے اپنے

چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن سے ملنے کا موقع مل جاتا تھا۔ زندگی کے یہ چند منٹ اس کے لئے انتہائی مسرت انگیز ہوتے تھے۔ اور تھوڑی دیر کو اس کی ساری کلفتیں دور ہو جاتی تھیں۔

ایک دن حسبِ معمول تانبے کا گگرا کمر پر رکھے بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ پہاڑی راستہ طے کر رہی تھی کہ سامنے سے اس کا چھوٹا بھائی دُنی رام آتا ہوا نظر آیا۔ دنی رام بہن کو دیکھتے ہی خوشی سے اچھلنے لگا۔ بڑی محبّت سے بولا۔

"للّی۔ آج ہم نے اور رادھا نے اُس پہاڑی پر بیر کھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ رادھا نیچے انتظار کر رہی ہے۔ میں تمہاری تلاش میں ہی آ رہا تھا۔ تم بھی چلو۔ بڑا مزہ رہے گا۔"

للّی نے گگرا زمین پر رکھ کر غور کرنا شروع کیا۔ آج ساس نے خاص طور پر کہا تھا کہ جلد پانی لانا۔ کیونکہ اس کا نہانے کا ارادہ تھا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ دُنی رام نے بڑی منت سے کہا۔

"للّی۔ میری اچھی للّی۔ آج ہم لوگوں کو مایوس نہ کرو۔ کیا تمہیں یاد نہیں پر سال بھی تم ہمارے ساتھ بیر کھانے گئی تھیں۔ کیسا لطف آیا تھا۔ آؤ چلو۔ بس دیر نہ کرو۔ رادھا بے چینی سے منتظر ہو گی۔"

للّی نے غور کیا کہ بلدیو آج صبح باہر گیا ہے۔ کل تک اس کی واپسی ہو گی۔ اب رہی ساس۔ اُن کی خوشی یا ناراضگی ایک بے معنی چیز ہے۔ اس لئے کیوں نہ آج بھائی بہن کے ساتھ چند گھنٹے لطف و مسرت میں گزارے جائیں۔

یہ فیصلہ کرتے ہی للّی نے جلدی جلدی گگڑے کو پاس ہی ایک جھاڑی میں چھپا دیا۔ اور دنی رام کے ساتھ چلدی۔ پہاڑی کے نیچے رادہا نے بھی للّی کا بہت مسرور ہو کر خیر مقدم کیا۔ اور تینوں بہن بھائی دوسری پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔

تقریباً بارہ بجے تک بڑے لطف و مسرت سے بیر کھاتے اور جمع کئے گئے۔ اور جب خوب جی بھر گیا تو یہ قافلہ واپس ہوا۔ للّی نے چاہا۔ کہ اپنی سسرال واپس جائے۔ لیکن کچھ تو بھائی بہن کے اصرار اور کچھ اس خیال نے کہ آخر دیر تو ہوئی ہے چلو کھڑے کھڑے ماں باپ سے بھی مل لوں۔ اُسے اپنے آبائی گاؤں جانے پر مجبور کر دیا۔ ماں باپ بھی للّی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دوپہر کا کھانا سب نے ساتھ کھایا۔ اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد للّی تیسرے پہر اپنے سسرال آگئی۔

ساس باہر ہی ملی اور حسب معمول معینہ لب ولہجہ میں للّی کی آؤ بھگت ہوئی۔ جس کے واسطے وہ پہلے ہی سے تیار تھی۔ اور مقررہ اصول کے بموجب ساس کی ہر گالی اور کوسنے کو اَن سُنی کرتی ہوئی مکان میں داخل ہوئی۔ اور کام میں مصروف ہو گئی۔ ابھی چند ہی منٹ گذرے تھے کہ ساس قضائے مبرم کی طرح اندر آئی اور للّی سے بولی۔

"نا شدنی، دن بھر کے بعد تو ایک گگرا پانی لے کر آئی ہے۔ اب یہ بھی دھیان ہے کہ جانور تجھے کھائیں گے یا میری ہڈیاں چبائیں گے۔ جانتی ہے بلدیو گھر پر نہیں ہے۔ آخر چارہ لینے کون جائے گا۔"

للّی کو واقعی اس کا خیال نہیں تھا۔ فوراً وہ ضروری سامان لے کر جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔ حالانکہ اب شام قریب تھی۔ اور مطلع بھی کسی قدر ابر آلود تھا تاہم للّی کو یقین تھا کہ وہ چراغ جلنے سے پہلے ہی چارہ لے کر مکان آجائے گی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ چارے کے واسطے اُسے ایک مخصوص پہاڑی پر چڑھنے اور اترنے کی پوری مسافت طے کرنا تھی۔ لیکن یہ ایک روزمرّہ کی چیز تھی۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر جب للّی نے دوسری طرف اترنا شروع کیا تو اُسے اندازہ ہُوا۔ کہ ابر زیادہ مخلوط ہوتا جارہا ہے۔ لیکن اب بھی اُسے یقین تھا کہ کسی غیر معمولی خطرہ کا امکان نہیں ہے۔ پہاڑی کے نیچے پہنچ کر اُس نے ایک درخت کو منتخب کیا اور لہنگے کو لنگوٹ کی طرح باندھ کر چڑھ گئی۔ ابھی دو چار شاخیں ہی کاٹنے پائی تھی کہ ہلکی ہلکی بارش کے ساتھ ایک خاص قسم کی سنسناہٹ سنائی دی۔ جو للّی کے واسطے ایک اہم خطرے کا لازم تھا لیکن اس نے اب بھی ہمت نہ ہاری اور برابر چارہ کاٹتی رہی۔ چند منٹ گزرے تھے کہ بارش میں تیزی شروع ہوگئی اور ساتھ ہی طوفان پوری شدت سے ساری فضا پر مسلط ہو گیا۔ مجبوراً للّی کو درخت سے اترنا پڑا۔ تاکہ وہ اس سنسان جنگل میں طوفان کی ہلاکت سے محفوظ رہنے کے لئے پہاڑی کا کوئی گوشہ تلاش کر سکے اسے خیال تھا کہ طوفان جلد ہی فرو ہو جائے گا۔ لیکن اس کی شدت اور ہیبت بڑھتی ہی گئی۔ اور کئی گھنٹے گزر جانے کے باوجود اس میں کوئی کمی نہ تھی۔ للّی غریب نے بے آب و دانہ بیٹھے بیٹھے ساری رات گزار دی۔ صبح کے قریب طوفان ختم ہوا۔ اور للّی نے اطمینان کی سانس لی۔ چارے کی کمی کو پورا کیا۔ اور گٹھا باندھ رات بھر کی جاگی۔

بھوک سے نڈھال کسی نہ کسی طرح مکان پہنچی۔ حسبِ معمول ڈائن ساس دروازے پر موجود تھی۔ للّی کو دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو کر بولی۔

"خبردار۔ مکان کے اندر قدم نہ رکھنا۔ میں نے آج تک تیری تمام برائیوں کو نظرانداز کیا۔ لیکن اس آوارگی اور بدچلنی کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ غضب خدا کا یہ شریف بہو بیٹیوں کے ڈھنگ ہیں کہ وہ رات رات بھر مکان سے غائب رہیں"۔

ادھر للّی کے واسطے بھی ساس کے یہ الفاظ بالکل غیر متوقع تھے۔ آج تک اُس نے ساس کے تمام الزامات۔ بڑی سے بڑی ناخوشی اور بُری سے بُری گالیاں بہت خندہ پیشانی سے برداشت کی تھیں۔ لیکن اتنا زبردست اتہام اور اس قدر سنجیدگی کے ساتھ۔ وہ اس کے لئے کسی طرح تیار نہ تھی۔ سارے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ چارے کا گٹھا غیر اختیاری حالت میں خود سر سے زمین پر آرہا۔ اس نے چاہا کہ ساس کو جواب دے مگر زبان تالو سے لگ کر رہ گئی۔ ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ مایوسانہ انداز میں اس نے ساس اور مکان پر آخری نظر ڈالی اور پلٹ کر چل دی۔ اُسے مطلق خبر نہ ہوئی کہ وہ کس راستے سے اور کہاں جا رہی ہے۔ جب وہ اپنے گھر پہنچی تو سخت بخار تھا۔ اور دماغ ماؤف۔ حتٰی کہ ماں باپ کو بھی یہ نہ بتا سکی کہ وہ دوسرے ہی دن کیوں واپس آگئی اور یہ اسکی حالت کیوں ہے۔

دن کے بعد ہفتے گزر گئے۔ لیکن للّی موت و زیست کے درمیان معلّق تھی۔ بلدبو دوسرے تیسرے دن آجاتا تھا۔ جس کی زبانی للّی کے والدین کو اس کا

پتہ ضرور چل گیا کہ ساس بہو میں کچھ ان بن ہو گئی ہے۔ مگر تفصیلی واقعات کا علم کسی کو نہ تھا۔ خدا خدا کر کے کافی عرصہ بعد للی کی حالت کسی قدر سنبھلی اور وہ چلنے پھرنے لگی۔ نہ صرف بلدیو کے اصرار پر بلکہ ماں باپ کو خود بھی اس کا خیال ہوا کہ اب للی کو اپنے سسرال جانا چاہیئے۔ لیکن جب کبھی اس کا تذکرہ آیا، للی نے صاف انکار کیا۔ جس کو ایک معمولی بات سمجھ کر ٹال دیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن للی کے باپ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

" میں تمام معاملات طے کر آیا ہوں۔ اب کوئی بات نہ ہوگی۔ اس لئے اب للی کو کل صبح جانے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے "۔

اس نادر شاہی فیصلہ پر للی نے باپ سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ساس کی زندگی میں تو سسرال جانے سے رہی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کو ختم کر دے۔ اور اس فیصلہ کے بموجب اس نے یہ بھی طے کر لیا کہ کل صبح گھر والوں کے بیدار ہونے سے پہلے وہ اٹھکر سیدھی جھیل جائیگی اور ڈوب کر جان دے دے گی۔

چونکہ اس فیصلہ کے بموجب اُسے بہت سویرے اٹھنا تھا۔ اس لیئے وہ جلد ہی سو گئی۔ کافی رات گئے ایک زبردست دھماکے سے وہ چونک پڑی۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ سخت بارش اور طوفان برپا ہے۔

طوفان کی شدت کے باوجود للی اپنے ارادے میں اٹل تھی۔ صبح اٹھنے کے خیال میں اب بھی کوئی تبدیلی نہ تھی۔ وہ پھر جلد ہی سو گئی۔ اور بالکل بے خبر آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ گیا تھا۔ طوفان فرو ہو چکا تھا۔ گھر کے آدمی چل پھر رہے

تھے۔ اور سورج چمک رہا تھا۔ ظاہر ہے۔ کہ اب للی کے واسطے اپنی تجویز کو بروئے کار لانا ناممکن تھا۔ جھیل پہ جانے کے لئے کوئی معقول عذر نہ تھا۔ علاوہ اس کے اب تھوڑی دیر ہی میں اُسے تیار ہونے کا حکم دیا جائے گا۔ ہنوز وہ بستر پر بیٹھے اس ناکامی پر کفِ افسوس مل رہی تھی۔ کہ باہر سے آدمیوں کی ہنی جلی اور جلد جلد باتیں کرنے کی آواز آئی۔ گو صحیح طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ لیکن للی نے یہ اندازہ ضرور کیا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ضرور ہے۔ صحیح حالات معلوم کرنے کی بے چینی نے اُسے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کوٹھری سے نکل کر باہر آرہی تھی کہ چھوٹا بھائی خوش خوش اندر آیا۔ اور للی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تمہاری ساس ختم ہو گئی۔ کل رات جو دھماکا ہوا تھا۔ وہ درحقیقت پہاڑی کا ایک حصہ الگ ہو کر گاؤں پہ گرا تھا جس نے تمہارے مکان کو برباد کر دیا۔ خوش قسمتی سے بلدیو جیجا باہر گئے ہوئے تھے وہ بچ گئے اور باہر کھڑے ہیں۔ لیکن تمہاری منحوس ساس مکان میں دب کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ اب تم اپنی سُسرال اطمینان سے جا سکتی ہو۔"